دھرتی ماں اداس ہے
خالد سہیل

دھرتی ماں اداس ہے

دھرتی ماں اداس ہے

(کہانیاں)

۱۹۹۰ تا ۱۹۹۵

خالد سہیل

ناشر

کیریٹیو لنکس
کینیڈا

مصنف : خالد سہیل

اشاعت : ۱۹۹۷

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۱۰۰ روپے

کمپوزنگ : ساجدہ فرحین

کہکشاں گرافکس، ۱۵۰۱، جمعیۃ بلڈنگ، گلی قاسم جان، دہلی

مطبع : ایرانین آرٹ پرنٹرس، دہلی

ناشر

Creative Links
P-6, 100 White Oaks Crt,
Whitby Ontario Canada 1B7

تقسیم کار:

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ٦

☆☆ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔ ۲

DHARTI MAAN UDAS HAI (Short Stories) 1997
Dr. Khalid Sohail Rs. 100/-
P-6, 100 White Oaks Crt Whitby
Ontario Canada LIP 1B7

Publisher : *Creative Links*, Canada

انتساب

اپنی

نانی اماں

کے نام

جن سے

میں نے

احترام انسانیت کا تحفہ

ورثے میں

پایا

تخلیقات

ادب

تخلیقی چشمے

اور

فردا کے خواب

چند سال پیشتر پاکستان کے سفر کے دوران جب میں چند دنوں کے لیے کراچی رکا تو وہاں کے ادب نواز دوستوں نے مجھے اپنی ایک ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کی خدمت میں ایک افسانہ پیش کروں۔ جب میں محفل میں پہنچا تو ایک نوجوان ادبی صحافی کہنے لگیں کہ افسانہ سنانے سے پہلے وہ میرا انٹرویو لینا چاہتی ہیں اور انہوں نے اپنے بریف کیس میں سے ایک سوال نامہ نکالا۔ شہر کے معتبر اور اپنے بزرگ ادیبوں کے سامنے انٹرویو دینے کا میرا یہ پہلا موقع تھا لیکن میں نے بغیر کسی تامل کے کہا:

''آپ پوچھیں جو سوال پوچھنا چاہتی ہیں''

وہ محترمہ کہنے لگیں ''خالد سہیل صاحب! آپ نے شاعری بھی کی ہے، افسانے بھی لکھے ہیں، مضامین اور سفرنامے بھی تحریر کیے ہیں اور عالمی ادب کے تراجم بھی چھپوائے ہیں۔ آپ بنیادی طور پر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں آپ کی ادبی شناخت کیا ہے''؟

''کچھ بھی نہیں'' میں نے بے ساختہ کہا۔

میرے اس مختصر سے جواب سے وہ محترمہ کچھ گھبرا سی گئیں کیونکہ ان کے باقی سوالوں کا دارومدار اس پہلے سوال کے جواب پر تھا۔ اس محفل کے ادیب بھی کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ پہلے تو میں چند لمحے خاموش رہا لیکن پھر ان محترمہ کی آنکھوں سے جھلکتی حیرانی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے موقف کی وضاحت کروں۔

میں نے کہا ''محترمہ! ایک ادیب کی حیثیت سے میں اپنی ذات، اپنے معاشرے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔ میں زندگی کو ایک خاص زاویے سے دیکھتا ہوں، لوگوں سے ایک خاص انداز سے ملتا ہوں اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ایک خاص قسم کے خواب دیکھتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنے ان مشاہدات، تجربات اور خوابوں کا تخلیقی اظہار الفاظ کی صورت میں کرسکوں تاکہ میرے مرنے کے بعد اگر کوئی شخص میری ساری تخلیقات کو پڑھے تو اس پر وہ نقشہ واضح ہوسکے، جسے میں ساری عمر بنانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میری نگاہ میں اس نقشے کی تکمیل مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور غزل، نظم، افسانہ، مضمون، سفرنامہ، یا کسی عالمی ادبی شہ پارے کا ترجمہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مختلف اصناف، مختلف قسم کے نکتے، خطوط اور قوسین ہیں جو اس نقشے کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ وہ سب نگارشات اس گلدستے کے مختلف پھول ہیں جو میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس انٹرویو میں اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ میری نگاہ میں کامیاب ادیب اپنی تخلیقات میں نہ صرف اپنی ذات کا تخلیقی اظہار بھرپور طریقے سے کرتا ہے بلکہ اپنے اور قارئین کے درمیان ابلاغ کا پل تعمیر کرنے میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اگر میری تخلیقات

میرے صاحب ذوق قارئین کی سمجھ میں نہ آئیں تو اس میں نقصان میرا ہے نہ کہ قارئین کا۔ اس لئے میں اپنی تخلیقات پر مزید محنت کرنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ میں ادیب کے طور پر قارئین کے ساتھ اپنے ادبی اور انسانی رشتے کا احترام کرتا ہوں میرا مقصد اپنے قارئین کو اپنے تجربات میں شریک کرنا (To Share) ہے نہ کہ ان پر رعب جمانا (To Impress) میرے نزدیک فنکار کی عظمت اس کی عاجزی اور منکسر المزاجی میں ہے نہ کہ غرور اور تکبر میں۔ پھلدار ڈالی اکثر اوقات جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

میری نگاہ میں ادیب سائنس دانوں، فلسفیوں اور فنکاروں کے اس قافلے کا ایک مسافر ہے جو انسانیت کے لیے ایک خوب سے خوب تر زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور اس منزل کے حصول کے لیے عمر بھر ریاض کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ:

سائنس داں ۔ عقل اور منطق کا

فلاسفر ۔ وجدان کا

اور

فنکار ۔ جمالیات کا راستہ اختیار کرتے ہیں

ان کے راستے چاہے جدا ہوں لیکن ان کی منزل ایک ہی ہوتی ہے وہ سب انسانیت کے لیے ایک بہتر زندگی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نوجوانی کے زمانے سے ہی سائنس، فلسفے اور ادب کا طالب علم رہا ہوں اور میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنی تخلیقی شخصیت میں ان علوم کی روشنی کو جذب کر کے ان کے رنگ، قوس قزح کے رنگوں کی طرح، اپنی تخلیقات میں پیش کر سکوں۔

میری نگاہ میں ادب انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے

درمیان ایک پل تعمیر کرتا ہے۔ اس کے ڈانڈے ایک طرف زندگی کے مسائل سے اور دوسری طرف جمالیات کی اعلیٰ اقدار سے جڑے ہوتے ہیں۔ اس کا رشتہ ایک طرف ادیب کی ذاتی زندگی سے اور دوسری طرف تاریخ سے جڑا ہوتا ہے۔ ادیب ہر موڑ پر ان مختلف قوتوں اور عوامل کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی توازن اس کی تخلیقات میں ایک ایسا حسن پیدا کرتا ہے جس کا تاثر قارئین کے ذہن، دل، اور روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے اور وہ بھی ادیب کے خواب کو اپنا خواب سمجھ کر اس کی تعبیر تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک مہاجر ادیب کی حیثیت سے میں مہاجروں کے اس قافلے کا مسافر بھی ہوں جنہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ:

مشرق سے مغرب

تیسری دنیا سے پہلی دنیا

اور پرانے گھر سے نئے گھر کی طرف ہجرت کا سفر پل صراط پر چلنے سے کسی طرح کم نہیں جس کے ایک طرف ان دیکھے عذابوں کا جہنم تو دوسری طرف انجانی بصیرتوں کی بہشت آباد ہیں وہ مہاجر اور وہ ادیب جو ان دو معاشروں کی زبانوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے پل صراط کو عبور کرنے کے تجربے میں کامیاب ہوئے ہیں ان کے دامن کی تیسری آنکھ کھل گئی ہے ایسی آنکھ جو انسان کی روح اور فردا کے خوابوں میں جھانکنے میں مدد کرتی ہے اسی لیے میرے خیال میں مہاجر ادیب بیسویں صدی کی زندگی کی جدوجہد کا استعارہ بن گیا ہے۔

جس طرح میں اپنے تخلیقی اظہار میں غزل، نظم، افسانے یا مضمون کی صنف کے انتخاب کو ثانوی حیثیت دیتا ہوں اسی طرح میرا خیال ہے کہ ادب میں بیانیہ، علامتی یا تجریدی انداز کا چناؤ بھی ثانوی ہے۔ اگر ادیب کا فن پارہ اس کے تخلیقی اظہار کے ساتھ ساتھ قارئین کے دل کی دھڑکنوں کو چھونے میں

کامیاب ہوا ہے تو وہ فن پارہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ میری نگاہ میں اس سلسلے میں ادیب کا خلوص، اپنی ذات کی سچائیوں سے کمٹمنٹ اور اپنے فن پر مہارت رکھنا نہایت اہم ہیں۔ اور یہ عشق ادیب سے عمر بھر کے ریاض کا متقاضی ہے۔ میں نے ذاتی طور پر پچھلے پچیس برس میں اپنے اس تخلیقی سفر اور فنی ریاض میں بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ ایک وہ دور تھا جب میرے من میں کبھی کبھار بارش ہوتی تھی، میں ایک دو غزلیں یا افسانے تخلیق کر لیتا تھا اور پھر خشک سالی کا موسم آجاتا تھا لیکن اب پچھلے چند سالوں سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر دن رات ٹھنڈے اور گرم پانی کے چشمے ابلتے رہتے ہیں اور روایتوں کی چٹانوں سے گزرتے ہوئے اپنا راستہ خود بناتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے بھی ان چشموں کو زندہ رکھنے کے لیے ایک مخصوص طرز زندگی اپنا لیا ہے۔

میرے ہر روز شام کو پڑھنے اور صبح دم تنہائی کے لمحات میں لکھنے اور طبع زاد تخلیقی کام میں مصروفیت نہ ہونے کے دوران ذاتی ڈائری اور ادبی دوستوں کو خطوط تحریر کرنے، عالمی ادب کے تراجم کرنے اور ہر چند ہفتوں کے بعد انجانی منزلوں کے سفر پر نکل کھڑے ہونے سے نہ صرف میری تخلیقی زندگی میں استقامت (Stability) پیدا ہو گئی ہے۔ بلکہ ارتقا (Evolution) کا عمل بھی جاری ہے۔ جس سے میں فنی مسرت (Artistic Satisfaction) حاصل کرتا رہتا ہوں۔ اگرچہ میرا تخلیقی سفر نہایت صبر آزما اور دشوار گزار رہا ہے لیکن میرے بے پایاں شوق، دوستوں کی پر خلوص رفاقت اور تعمیری تنقید نے اسے پر لطف اور پر معنی بنا دیا ہے۔ اسی لیے میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت انسان اور ادیب سمجھتا ہوں۔

مارچ ۱۹۹۶ء

دھرتی ماں
اداس
ہے

آج رات تم نے ایک کہانی سننے کی فرمائش کی ہے
اور میں
ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئی ہوں جب تم چھوٹی سی تھیں تو میں
تمہیں بہت سی کہانیاں سنایا کرتی تھی
وہ کہانیاں جو نانیاں اپنی نواسیوں کو سناتی ہیں
وہ کہانیاں جس میں شہزادے شہزادیوں سے شادی کرتے ہیں
اور ہنسی خوشی زندگیاں گزارتے ہیں
وہ کہانیاں جو من گھڑت ہوتی ہیں
وہ کہانیاں جنہیں سنتے سنتے بچیاں نیند کی آغوش میں کھو جاتی ہیں
لیکن آج جو کہانی
میں تمہیں سنانے والی ہوں
وہ ان سب کہانیوں سے مختلف ہے وہ ایک نئی کہانی ہے۔
جسے میں ساری رات سناتی رہوں گی اور تم ساری رات سنتی رہو گی۔

اب تم جوان ہو گئی ہو۔
اب تم جگراتا کرسکتی ہو۔

یہ وہ کہانی ہے جسے تم ایک دن اپنی نواسی کو سناؤ گی۔ اس طرح یہ کہانی نسل در نسل سینہ بہ سینہ چلتی رہے گی اور محفوظ رہے گی۔

یہ کہانی ایک ماں کی کہانی ہے۔ دھرتی ماں کی کہانی۔ ایسی ماں کی کہانی جس کے بیٹے اور بیٹیاں اسے جوانی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ دور دراز دیاروں میں جا بسے۔ انہوں نے کسی اور دھرتی کو اپنی ماں بنالیا اور وہ ماں جس نے انہیں اپنا خون پلایا تھا اپنا دودھ پلایا تھا وہ اپنے بڑھاپے میں اکیلی، تنہا اور اداس رہ گئی۔ یہ اسی اداس ماں کی کہانی ہے۔

بیٹی!

چاہے وہ ماں ہو یا دھرتی ماں جب
اسکی کوکھ بانجھ ہو جاتی ہے
جسم پر کانٹے اگ آتے ہیں
ہاتھوں میں لرزا طاری ہو جاتا ہے
آنکھوں کی چمک جاتی رہتی ہے
اور
پستانوں کا دودھ زہر بن جاتا ہے
تو جب بچے ماں کے سینے سے لگتے ہیں
تو وہ لہولہان ہو جاتے ہیں
ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں
وہ اپنی ماں کو الوداع کہہ کر اجنبی دیاروں میں جا بستے ہیں
پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے
اور اگر آتے بھی ہیں تو

ترس کھا کر
رحم کھا کر
اسکی تیمارداری کرنے کو
اپنا فرض نبھانے کو
محبت سے نہیں
پیار سے نہیں
اور وہ کچا دھاگا جو انہیں جوڑے ہوتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے
آنول کٹ جاتا ہے
ماں اور بچوں کے رشتوں میں زخم ابھر آتے ہیں ایسے زخم
جنہیں ماں ایک طرف
اور بچے دوسری طرف
چاٹتے رہتے ہیں
میری لاڈلی!
جب سے میں دنیا بھر کی سیاحت کر کے آئی ہوں
جب سے میں اپنے بیٹے بیٹیوں، نواسے نواسیوں، پوتے پوتیوں سے مل
کر آئی ہوں
جو شمالی امریکہ سے جنوبی افریقہ تک
اور
مشرق وسطیٰ سے مغربی یورپ تک پھیلے ہوئے ہیں
میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے
پچھلے چند مہینوں میں میں نے
کئی ڈاکٹروں، کئی حکیموں

کئی طبیبوں، کئی روحانی پیشواؤں
سے مشورہ کیا ہے
کوئی کہتا ہے بیماری میرے جسم میں ہے
کوئی کہتا ہے میرے ذہن میں ہے اور
کوئی کہتا ہے میری روح بیمار ہے
ایسی بیماری
جس کا زہر میرے سراپا میں پھیل چکا ہے
میں مانتی ہوں کہ میری بیماری
ایسی بیماری ہے
جس کا کوئی نام نہیں
جس کی کوئی تشخیص نہیں کر سکتا
جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا
جس کا کوئی علاج نہیں
جو زندگی کی شریانوں میں آسیب بن کر پھیل جاتی ہے اور
ہر امید، ہر خوشی اور ہر دعا کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہے۔
میری بیٹی!

اگر میں شاعرہ یا ادیبہ ہوتی تو اپنی سوانح عمری لکھتی۔ اپنی دھرتی کی تاریخ لکھتی لیکن نہ تو میرے ہاتھ میں قلم ہے اور نہ ہی جیب میں یونیورسٹی کی کوئی ڈگری۔ میں دوسروں کی نگاہوں میں جاہل اور ان پڑھ ہوں لیکن میں بخوبی جانتی ہوں کہ میں اس لیے ڈگریوں سے محروم نہیں رہی کہ میں کند ذہن تھی۔ میں تو اپنے بھائیوں سے زیادہ ذہین اور ہوشیار ہوا کرتی تھی لیکن مجھے اس لیے اسکول نہ بھیجا گیا کیونکہ میں ایک لڑکی تھی۔ میرے بچپن اور جوانی میں عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی تھی گھر والوں کی خدمت اور قربانی کی ریت نبھانی سکھائی جاتی تھی

اس لیے میرے بھائیوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی لیکن میں علم کی دولت سے محروم رہی، غریب رہی۔ جس دھرتی کی آدھی آبادی جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتی رہے اور جس خاندان کی ماؤں، مالکاؤں کو دستخط کرنا بھی نہ آتا ہو اس خاندان کا حشر کیا ہوتا ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔

لیکن مجھے علم کا شوق تھا

اور میں زندگی کی کتاب پڑھتی رہی

اور مجھے احساس ہوا کہ

انسان، علم یونیورسٹیوں او. درسی کتابوں کے بغیر بھی حاصل کر سکتا ہے شاید اسی لیے ہمارے بہت سے ان پڑھ، پڑھے لکھوں سے زیادہ قابل اور زندگی کے رازوں سے آشنا ہیں۔ صاحب نظر ہیں، دانا ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پڑھے لکھوں کی نظر میں جاہل ہیں۔

بیٹی!

مجھے اتنی خوشی ہے کہ تم نے جرنلزم میں ایم اے کیا ہے تم سیاسی شعور رکھتی ہو اور اپنی قوم کے مظلوموں اور محروموں کی کہانیاں لکھتی ہو۔ اگر کبھی موقع ملے تو اپنی نانی اور دادی کی کہانی بھی لکھنا۔

وہ کہانی جو ایک خاندان کی کہانی ہی نہیں

ایک عہد کی کہانی ہے۔

وہ اس دھرتی کی کہانی ہے جسے ہم پنجاب کہتے ہیں۔

جس کے سینے میں پانچ دریا بہتے ہیں۔

جو کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔

وہی کھیت جنہیں

کسان دن سے شام تک کاشت کرتے رہتے ہیں لیکن

انہیں کسانوں کو راتوں کو نیند نہیں آتی کیونکہ

ان کے بچے راتوں کو بھوکے سوتے ہیں اور
بیٹیاں کنواری رہ جاتی ہیں
بیٹی!

دریا چاہے پنجاب کے ہوں یا کسی اور دھرتی کے۔ ان سب کا تعلق پہاڑوں سے ہوتا ہے۔ ان پہاڑوں سے جن کی چوٹیوں پر برف کے تاج سجے ہوتے ہیں اور وہ گرمیوں میں پگھل کر وادیوں میں اتر آتے ہیں اور دریا بن کر بہنے لگتے ہیں اور مختلف نام پاتے ہیں، اپنی شناخت دریافت کرتے ہیں، راوی اور ستلج کہلاتے ہیں لیکن پھر وہ ایک دن سمندر کو گلے لگا لیتے ہیں اور اپنی شناخت کو سمندر کی گہرائیوں میں مدغم کر لیتے ہیں۔ اس عمل میں نہ جانے وہ کیا کھوتے ہیں اور کیا پاتے ہیں:

بیٹی!
ہمارا خاندان بھی ان دریاؤں سے مختلف نہیں
ہم نے بھی کشمیر کے پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کیا تھا
ہمارے آباؤ اجداد
انہی پہاڑوں پر بستے تھے
انہی وادیوں میں زندگی گزارتے تھے
جہاں
پرندے چہچہاتے تھے
پھول مسکراتے تھے
چاند اور ستارے جگمگاتے تھے
اور
دنیا بھر کے انسان ان جھیلوں کی سیر کرنے آتے تھے
لیکن پھر

کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں کے باسیوں نے
اپنے خیمے اٹھائے
دھرتی ماں کو الوداع کہا
وہ ہجرت اس خاندان کی پہلی ہجرت ثابت ہوئی
اس کے بعد انہوں نے نہ جانے کتنی اور ہجرت کیں
کیونکہ
جب لوگ اپنے گھر ایک بار چھوڑ دیں
تو پھر انہیں کہیں سکون نہیں ملتا
جب دھرتی ماں سے ایک دفعہ رشتہ کٹ جائے
تو پھر کسی رشتے میں چین نہیں آتا
چنانچہ ہمارے خاندان کا قافلہ کشمیر سے چلا
تو اس نے امرتسر کی سرزمین پر آ کر ڈیرے ڈالے
خیمے اور دل لگائے اور گھر بسائے
جو لوگ اپنی مادری زبان کشمیری بولا کرتے تھے وہ پنجابی سیکھنے لگے اور دو نسلوں کے بعد بے تکلفی سے بولنے لگے۔
لیکن
یہ سکون، یہ خوشی، یہ اپنے پن کا احساس
عارضی ثابت ہوا
تاریخ نے اپنی تلوار اس انداز سے پھینکی کہ دلوں کے دو ٹکڑے ہو گئے
جہاں کشمیر اور بنگال دو حصوں میں بٹ گئے
وہیں پنجاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا
اور ہمیں
ایک دفعہ پھر مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب ہجرت کرنی پڑی

پہلے جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہوا
جس میں ہمارے کئی ساتھی اور رشتہ دار قربان ہوئے اور پھر
ایک دن
آدھی رات کو
ایک دھرتی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی
اور
ایک زبان بولنے والے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے
ایک ہی ماں کا دودھ پینے والے
ایک ہی کھیت میں کاشت کرنے والے
سوتیلے بھائی بن گئے
خون کے پیاسے ہو گئے
اور انسانوں کو ایک دفعہ پھر
ہابیل اور قابیل کی یاد دلانے لگے
بیٹی!

وہ دوسری ہجرت بڑی تکلیف دہ تھی۔ پہلی ہجرت میں تو ہمارے بزرگ صرف بے گھر ہوئے تھے۔ دوسری ہجرت میں تو بیٹیوں کی عزت اور باپوں کی غیرت بھی داؤ پر لگ گئی تھی۔

پہلی ہجرت کا حال تو کانوں نے سنا تھا لیکن دوسری ہجرت کا حال تو ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے۔ مت پوچھو ان دنوں کتنی صبحیں بے نور
کتنی دوپہریں بے رنگ
اور
کتنی شامیں تاریک ہو گئی تھیں۔

میں اکیلی اپنے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کو سینے سے لگائے رات رات بھر

جاگتی رہتی تھی۔ تمہارے نانا جو کشمیری شالوں کا کاروبار کرنے کلکتے جایا کرتے تھے مہینوں شہر سے باہر رہتے تھے اور میں گھر بار کا خیال رکھتی تھی۔

ان دنوں جو خبر بھی آتی بری ہی آتی تھی۔

میری بہن اور بھائی ہجرت کر کے لاہور جا چکے تھے اور ہمیں بلا رہے تھے لیکن میں تمہارے نانا کے بغیر کیسے جاسکتی تھی۔

میں ان کا انتظار کرتی رہی۔

ایک ایک دن ایک ایک صدی کی طرح گزارتی رہی۔

آخر وہ آئے تو ہم نے بھی ہجرت کا فیصلہ کیا اور تین نسلوں کے جمع کیے ہوئے گھر، جائداد اور کاروبار چھوڑ کر تین کپڑوں میں بچوں کو لے کر گھر سے نکلنے کی ٹھانی۔ تمہارے نانا کے ایک قریبی دوست تھے جو ان کی غیر موجودگی میں ہمارا خیال رکھتے تھے وہ بچوں سے حد درجہ محبت کرتے تھے ہم سب ان پر اعتبار کرتے تھے وہ گھر سے سواری لینے گئے تاکہ بچے آسانی سے اسٹیشن پہنچ سکیں۔

ایک گھنٹہ گزرا

دوسرا گھنٹہ گزرا

ہم سب بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔

جب کئی گھنٹے گزر گئے تو ہمیں احساس ہوا کہ وہ کسی کرپان یا تلوار یا بندوق کی زد میں آگئے ہیں۔ چنانچہ تمہارے نانا خود ایک ٹیکسی یا تانگہ لینے گئے۔ آدھے راستے میں انہیں ایک بچپن کا سردار دوست مل گیا۔ کہنے لگا خواجہ صاحب چوراہے تک گئے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ وہ کہیں سے گاڑی لے کر آیا۔ ہمیں اس میں چھپایا اور اسٹیشن تک چھوڑ آیا۔

اسٹیشن پہنچ کر پتہ چلا کہ مسافر گاڑی اڑتالیس گھنٹوں سے کھڑی ہے۔ ڈرائیور بلوائیوں کے ڈر سے گاڑی نہیں چلاتا۔ لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح گاڑی سے لپٹے ہوئے، کھڑکیوں سے لٹک رہے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے

تھے۔

ہم نے بچوں کو پلیٹ فارم پر بٹھادیا اور انتظار کرنے لگے۔

نہ جانے کس چیز کا

کسی کرامت کا

کسی معجزے کا

کسی ایسی کرامت اور معجزے کا جو ہمیں امرتسر سے اٹھا کر لاہور لے جائے۔

چوبیس گھنٹوں کے انتظار کے بعد جب گاڑی چلنے لگی تو تمہارے نانا کو خیال آیا کہ کیوں نہ ہم گاڑی کی چھت پر بیٹھ جائیں۔

چنانچہ میں چاروں بچوں کو لے کر لوگوں کے کندھوں پر پاؤں رکھتی ہوئی اوپر چڑھ گئی اور پھر تمہارے نانا بھی آگئے۔

دو گھنٹوں کا سفر بارہ گھنٹوں میں طے ہوا۔

گاڑی جگہ جگہ رکتی، خطرے کو سونگھتی اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتی سیکڑوں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے ہتھیلی پر جان لیے سفر کر رہے تھے۔

جب گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر پہنچی تو سب نے سکھ کا سانس لیا جیسے موت کی سزا ٹل گئی ہو۔

میرے اور تمہارے نانا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میرے آنسو خوشی کے تھے کہ بچوں کی جان بچ گئی۔

تمہارے نانا کے آنسو غم کے تھے کہ ان کے دوست کی جان قربان ہو گئی۔

اس غم نے ان کے دل پر ایسا زخم لگایا جو کبھی مندمل نہ ہو سکا۔

وہ ہجرت قیامت کی تھی۔

کچھ دریا کے اس پار رہ گئے۔

کچھ دریا کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئے

اور کچھ دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے۔

وہ دریا بھی عجیب تھا۔ کہیں خون تھا، کہیں آگ، کہیں وفاداریاں تھیں، کہیں ایمان، اس ہجرت میں ہم نے نجانے کیا کھویا کیا پایا۔

جو مہاجر دریا پار کر آئے انہوں نے اپنے باغباں کے ساتھ مل کر نیا گلستاں سجانے کی ٹھانی نئے پودے لگائے اور ان پودوں کو

امیدوں کی کھاد

آرزوؤں کی دھوپ

قربانیوں کے خون

اور

دعاؤں کے پانی سے سینچا

ہمیں امید تھی کہ جب یہ پودے تن آور درخت بنیں گے تو ہم ان سے سکون، آشتی اور انسان دوستی کے پھل پائیں گے۔

لیکن ابھی اس گلستاں کو سجائے، پودوں کو لگائے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ اس کا باغباں ہم سے جدا ہوگیا وہ باغباں جسے اس کی قوم کے غم نے دق کا مریض بنا دیا تھا۔

جو راتوں کو اپنے کمرے میں بے چینی سے چکر لگاتا رہتا تھا جسے شکایت تھی کہ اس کی جیب میں کھوٹے سکے تھے۔ جو اپنے گلستاں میں جمہوریت، سیکولر نظریات اور انسان دوستی کے درختوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

باغباں کے رخصت ہونے کے بعد باغ میں مذہب اور تنگ نظری کی اتنی تیز آندھی چلی کہ روشن خیالی کے چراغ کانپنے لگے۔

نئی بستی کے سنہرے خواب دیکھنے والوں کے دل بیٹھنے لگے اور آندھی کئی برس چلتی رہی۔ اس نے بہت سوں کے نقاب اتار پھینکے اور بہت سے ایسے

چہرے جو مہربان اور معتبر سمجھے جاتے تھے خود غرض اور گھناؤنے نکلے۔

لاہور میں میری بہن نے اپنے چھوٹے سے گھر میں مجھے بھی پناہ دے رکھی تھی۔ جب دل بڑا ہو تو جگہ خود بہ خود نکل ہی آتی ہے۔ ہم نے تنگی میں، عسرت میں، مشکلات میں، مسائل میں وقت گزارا لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

سردیوں میں آدھی رات کو ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھوئے
گرمیوں میں دہکتے چولھے پر روٹیاں پکائیں
محنت کی، مزدوری کی۔

اور

اپنے چاروں بچوں کو اسکول بھیجا، کالج بھیجا، یونیورسٹی بھیجا انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے بیٹوں کے برابر تعلیم دلواؤں گی۔ سب بچوں کو ایک ہی نظر سے دیکھوں گی کوئی تفریق نہ کروں گی۔

جب تمہارے بڑے ماموں نے ایم اے پاس کیا اور وہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے، تو میں نے لڈو اور جلیبیاں بانٹیں، غریبوں کو کھانا کھلایا۔ ہجرت کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ سارے خاندان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

تمہارے ماموں کو یونیورسٹی میں تعلیم کی اچھی نوکری مل گئی اور ہم نے ایک بڑا گھر خریدا۔ ایسا گھر جس کے صحن میں درخت تھا، درخت پر پرندے آکر بیٹھتے تھے اور گرمیوں میں ہم درخت کے سائے میں چارپائیاں ڈالتے تھے۔ وہیں چڑیاں، کبوتر اور مرغیاں بھی آکر پناہ لیتے تھے۔

تمہارے ماموں نے جلد ہی شہر میں نام پیدا کر لیا۔

اس نے قوم کے نوجوانوں کے ساتھ بڑی محنت کی۔ انہیں اعلیٰ اقدار کی تعلیم دی۔

آشتی اور امن کا درس دیا۔

حق اور انصاف کا سبق پڑھایا۔

اپنے اعلیٰ کردار سے مثالیں دیں۔

لیکن وہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔

سارے گلستاں میں تعصب کے شعلے بھڑک اٹھے

دھرتی ماں نے ماتم کرنا شروع کر دیا۔

قوم کے چند افراد اور خاندانوں کو سوتیلا قرار دیا گیا

ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا۔

ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔

ان کی عزت پر حملے کیے گئے۔

ان کے گھروں کے باہر کوڑے کے ٹوکرے پھینکے گئے انہیں شہری حقوق سے محروم کیا گیا۔

ان کی حب الوطنی اور وفاداری پر شک کیا گیا۔

ایمان اور کفر کی عدالتیں قائم کی گئیں۔

لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا ایمان ثابت کریں۔

بیٹی! جس دھرتی پر لوگوں کے حقوق پامال کیے جائیں وہاں عذاب نازل ہوتے ہیں۔ غصے، نفرت اور تلخی کی چنگاریاں ابھرتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں کا روپ اختیار کر جاتی ہیں اور سب کچھ راکھ کر ڈالتی ہیں۔

جو لوگ اس دھرتی کو دارالامان سمجھ کر آئے تھے انہیں کوفے کی یاد آگئی۔

جہاد کا اعلان کر دیا گیا

اور تمہارے ماموں کے ایک قریبی دوست
ایک ہمدرد، محنتی اور مخلص استاد
جنہوں نے برسوں قوم کے بچوں کو پڑھایا، لکھایا، تربیت کی، کردار کا آئینہ دکھایا۔
وہ ان شعلوں کی لپیٹ میں آگئے
ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا
طلباء نے ان کے گھر پر حملہ بول دیا۔
ان کے کمروں سے ان کی کتابیں، قرآن کریم، مذہبی نسخے، بیوی کے کپڑے، بچوں کے کھلونے، سب کو چوراہے پہ جمع کیا گیا اور آگ لگادی گئی۔
تمہارے ماموں نے بہت روکنا چاہا لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی کہنے لگے "شکر کرو ہم تمہارا گھر نہیں جلا رہے"
اس دن تمہارے ماموں اور نانا ساری رات روتے رہے۔ آنسو بہاتے رہے، زخم چاٹتے رہے، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے رہے۔ تمہارے نانا کہنے لگے میں نے اپنے دوست کی قربانی دی تھی کہ ایسی دھرتی پر جاکر رہوں گا جہاں نفرت اور تعصب کا سایہ تک نہ ہوگا لیکن اب تو حالات اور بھی بدتر ہو گئے ہیں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کے خلاف جنگ اور جہاد کا اعلان کر دیا ہے جنگ جمل کی یاد تازہ ہو گئی ہے اب ہم کس کو شہید کہیں اور کس کو غازی سمجھیں۔
تمہارے ماموں کو اپنے دوست کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ ہفتوں سیاہ کپڑے پہنتا رہا۔ آخر وہ کہنے لگا کہ جس دھرتی پر طلباء اپنے استاد کا احترام نہ کریں وہاں رہ کر کیا کرنا۔ جب استاد کی پگڑی اچھال دی جائے تو پھر اور کس کی عزت محفوظ ہے اور پھر ایک دن تمہارا ماموں رات کی تاریکی میں گھر سے نکلا اور انجانی دھرتی کی طرف ہجرت کر گیا۔
وہ خاندان کا پہلا بیٹا تھا جس نے اپنی ماں، دھرتی ماں کو داغ مفارقت

دیا تھا۔ اس نے مڑ کر نہ دیکھا وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مبادہ وہ اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائیں۔ میں مدتوں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ بیٹے کو تلاش کرتی رہی، گلیوں اور بازاروں میں ماری ماری پھرتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس دھرتی کا یوسف ہو جسے اس کے سوتیلے بھائی کنویں میں پھینک آئے ہوں۔ میں نے یعقوب کی طرح بہت آنسو بہائے۔

مدتوں بعد تمہارے ماموں کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ تمہارے ماموں کا دوست، جس کا گھر جلایا گیا تھا یورپ میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے چلا گیا تھا اور اس نے خود جنوبی افریقہ میں ہی ڈیرے ڈالے تھے ایک نئی زندگی شروع کی تھی۔

بڑے بیٹے کے چلے جانے سے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرا دایاں بازو کاٹ ڈالا ہو۔

تمہارے نانا کے بھی زخم ہرے ہو گئے کہنے لگے۔

یہ کیسی آزادی ہے

یہ کیسا نیا قانون ہے

یہ کیسی نئی روایت ہے

اور ہم سب نئے قانون، نئی روایت اور نئی آزادی پر خون کے آنسو بہاتے رہے

بیٹی! تمہیں نیند تو نہیں آ رہی

تم تھک تو نہیں گئیں

تم کچھ زیادہ افسردہ تو نہیں ہو گئیں

یہ کہانی کافی لمبی ہے ساری رات چلے گی

اگر ہمت ہے تو سنتی رہو ورنہ سو جاؤ

جب میں نے زخموں سے پردہ اٹھایا ہی ہے تو آج سارے زخم دیکھ لو تم

سے کیا چھپانا۔ تم نے بھی تو یہ درد وراثت میں پائے ہیں۔

جب میرا بڑا بیٹا چلا گیا تو میں اپنے چھوٹے بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو تعلیم دلواتی رہی اور ان کی تعلیم سے خود بھی بہت کچھ سیکھتی رہی۔ مجھے اس دوران احساس ہوا کہ جو تعلیم میں نے والدین سے نہ سیکھی تھی وہ اپنے بچوں سے سیکھ رہی تھی۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ
ہر بیٹا اپنے باپ کو
ہر بیٹی اپنی ماں کو
اور ہر نئی نسل پرانی نسل کو کچھ نہ کچھ سکھاتی ہے۔ نئی راہیں دکھاتی ہے اور نئے سوالوں سے آشنا کراتی ہے۔

اور میں اپنے بچوں کے روپ میں تعلیم حاصل کرتی رہی اپنی پیاس بجھاتی رہی۔ اس دھرتی کے کچھ سپوت کوشاں رہے کہ اس گلستاں میں انسان دوستی اور انصاف کے پودے پروان چڑھتے رہیں لیکن جن کے مفادات پر زد پڑتی تھی وہ نہ مانے۔

جمہوریت نے ابھی انگڑائی بھی نہ لی تھی کہ
جابرانہ حکومت کا سایہ سروں پر منڈلانے لگا
آدمیت نے قدم جمانے چاہے تو
ڈکٹیٹر شپ کا سانپ پھنکاریں مارنے لگا
دھرتی کے بچے ابھی مذہبی جنون کی آندھی سے بچ بھی نہ پائے تھے کہ
آمریت کے زلزلے کی زد میں آگئے
عوام کے
ہونٹوں پر مہریں لگادی گئیں
زبانوں پر تالے ڈال دیے گئے

آوازوں کو محصور کر دیا گیا

ریڈیو، ٹی۔وی، اخباروں پر، آزادانہ فکر اور تنقیدی سوچ پر پابندیاں لگا دی گئیں۔

لوگوں کو اپنے گھروں میں

گھٹن کا، حبس کا احساس ہونے لگا

میری دونوں بیٹیوں نے جبر اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایک نے انسانی حقوق اور دوسری نے عورتوں کے حقوق کے حوالے سے۔ ایک نے کہا کہ اس دھرتی پر کارخانوں، کھیتوں اور دفاتر میں کام کرنے والے مزدور عزت نفس سے محروم ہو گئے ہیں۔

دوسری نے کہا اس دیار میں

عورتوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا ہے

نہ وہ امام مسجد بن سکتی ہیں

نہ ہی امیر جماعت

وہ چاہے کتنی ہی ذہین، قابل اور اعلیٰ کردار کی مالک کیوں نہ ہوں

انہیں قوم کی قیادت کی اجازت نہیں ملتی

اصحاب اختیار اور ارباب شریعت کو

ان کی باتیں پسند نہ آئیں

دونوں کو باغی اور غدار قرار دیا گیا

انہیں ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا

دیکھتے ہی دیکھتے دو بہنیں، ایک ڈاکٹر، ایک پروفیسر بے روزگار ہو گئیں۔

انہوں نے اپنے بڑے بھائی سے رابطہ قائم کیا۔

وہ کہنے لگا جس دھرتی پر بیٹیوں کی عزت محفوظ نہ رہے وہ رہنے کے

قابل نہیں۔

چنانچہ ایک بیٹی نے مغربی یورپ کا اور دوسری نے شمالی امریکہ کا رخ کیا اور ان بیٹیوں کو جنہیں اپنوں نے دھتکارا، ذلیل و خوار کیا، بیکار کیا۔ اغیار نے ہاتھوں ہاتھ لیا، عزت دی اور اچھی ملازمت دی۔

مجھے یوں لگا کسی نے میرا بایاں بازو بھی کاٹ دیا ہو۔ میں اتنی روئی کہ میرے آنسو خشک ہو گئے۔

اگلے چند سال گھر میں صرف ہمارا چھوٹا بیٹا، اور تمہارے چھوٹے ماموں رہ گئے تھے۔ اس لیے ہمیں گھر سونا سونا، اداس اور غمگین لگتا۔ وہ تو یونیورسٹی پڑھنے چلا جاتا اور تمہارے نانا اور میں گھر میں اکیلے رہ جاتے۔

تمہارے نانا نے ریٹائرمنٹ اختیار کر لی تھی اور ماضی کے دریچے کھول لیے تھے۔ وہ بار بار پرانے گھر، پرانی دھرتی اور پرانے دوستوں کو یاد کرتے رہتے۔ ان کے خوابوں پر بھی ان کے چہرے کی طرح جھریاں پڑ گئی تھیں۔

وہ سارا سارا دن خلاؤں میں گھورتے رہتے اور بیٹے سے کہتے کہ یہ نیا دیس ہم نے بڑی محنتوں اور بڑی قربانیوں سے حاصل کیا ہے اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ وہ باپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔

وہ مادرِ وطن کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس گلستاں کے پرندوں، پھولوں اور پودوں کو خارجی شکاریوں اور ڈاکوؤں سے بچانا چاہتا تھا۔

کچھ عرصہ وہ کشمیر کی دھرتی پر تعینات رہا
وہ دھرتی جہاں سے اس کے آباؤ اجداد نے پہلی دفعہ
ہجرت کی تھی
وہ دھرتی جس کے دل کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے
وہ دھرتی جو اپنے مستقبل سے بے خبر تھی

وہ سوچا کرتا کہ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی کیا وجہ ہے کہ اس دھرتی کے لوگوں سے کسی نے نہ پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔

اسے یوں لگتا جیسے برسوں سے دو دولہا ایک ہی دلہن کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور کئی دفعہ لڑائی جھگڑے قتل و غارت جنگ و جدل پر تیار ہو گئے تھے لیکن کوئی اس دلہن سے پوچھنے کو تیار نہ تھا کہ وہ کس دولہا کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے عین ممکن ہے کہ وہ دلہن ان میں سے کسی دولہا کو بھی پسند نہ کرتی ہو اور اکیلی رہنا چاہتی ہو اور آزاد و خود مختار زندگی گزارنا چاہتی ہو۔

ایک دفعہ تمہارا چھوٹا ماموں چھٹیاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا کہ ریڈیو نے بری خبر سنائی۔ تاریخ کی تلوار نے ایک دفعہ پھر حملہ کیا تھا اور اس دفعہ دھرتی کے مشرقی اور مغربی حصوں کو جدا کر دیا تھا۔

فوجیں بلائی گئیں تمہارے ماموں کو بھی بلایا گیا اور اسے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ دھرتی کے مشرقی کنارے بھیج دیا گیا۔

وہ فوجیں جو دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کی گئی تھیں انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنوں کے خون سے ہاتھ رنگیں اپنے بھائیوں پر گولی چلائیں۔

ہزاروں فوجیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن تمہارے ماموں نے انکار کر دیا۔ اس کا کورٹ مارشل ہوا اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔

دھرتی کا کلیجہ ایک دفعہ پھر شق ہو گیا وہ دھرتی جو ایک دفعہ پہلے بھی دو ٹکڑے ہوئی تھی ایک بار پھر دو حصوں میں بٹ گئی۔

ایک ایسا زلزلہ آیا کہ دھرتی کے چاہنے والوں کے خوابوں کے محل چکنا چور ہو گئے۔

اس گلستاں میں جہاں باغباں نے چوبیس سال پیشتر پودے لگائے تھے جب وہ درخت بنے تو ان کے پھل کڑوے نکلے۔ گلستاں کو چاہنے والے سوچنے لگے کہ کیا ان پودوں کے بیج ناقص تھے یا انہیں اس مقدار میں پانی ہوا، کھاد اور

دھوپ نہ ملی تھی جن کی انہیں ضرورت تھی اور جوان کا حق تھا۔

اس دھرتی کی بساط پر لسانی اور ثقافتی رشتوں کے آگے مذہبی آدرشوں نے شہ مات کھائی تھی۔

چمن کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ جو لوگ گلستاں یا پھول توڑ رہے تھے اور پرندوں کا شکار کر رہے تھے وہ باغباں کے بچے ہی تو تھے۔ تمہارا ماموں جب جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس کی زندگی بدل چکی تھی۔ وہ دھرتی پر لشکری آسیب سے خوفزدہ تھا۔ اس کی محبت، اس کی ذہانت، اس کی شرافت، اس کی عزت نفس، اس کی وفا کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی وفاداری عوام سے تھی حکومت اور خوف سے نہیں تھی۔ حکومت اور فوجیں تو آتی جاتی رہتی ہیں دھرتی اور عوام وہی رہتے ہیں لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔

آخر ایک دن وہ بھی رات کی تاریکی میں گھر سے نکل گیا اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔

مدتوں بعد پتہ چلا کہ اس نے مشرق وسطیٰ میں کاروبار شروع کر دیا ہے اور عرب کے بدوؤں سے عربی سیکھ رہا ہے۔

تمہارے چھوٹے ماموں کے چلے جانے کے بعد تمہارے نانا اور میں بالکل تنہا رہ گئے۔ بڑھاپے میں ایک دوسرے کا سہارا۔ جن بچوں کو عمر بھر دودھ اور خون پلایا تھا وہ گھونسلہ چھوڑ کر اڑ گئے تھے۔ اگرچہ میری بہن اور بھائی اور ان کے بچے ہمارا خیال رکھتے تھے لیکن مجھے یہی دکھ تھا کہ میرے اپنے بچے میرے پاس نہ تھے۔

میں کبھی کبھار سوچتی کہ میں نے اور اس دھرتی نے کیا گناہ کیے ہیں کہ ہمیں یہ سزا مل رہی ہے۔

لیکن پھر اس دھرتی پر عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو کسی کرامت یا

معجزے سے کم نہ تھا۔

اس دھرتی پر عوامی تحریک چلی، غریبوں نے سر اٹھائے

محروموں کو نئی امید ملی

محصور آوازیں آزاد ہوئیں

خاموش زبانوں نے ترانے گائے

اقلیتوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا

ایک آس، ایک امید، ایک آرزو، ایک تمنا، ایک خواب نے انگڑائی لی

اس دوران دھرتی سے رخصت ہونے والے بیٹوں اور بیٹیوں کو جو دوسری دھرتیوں پر جا بسے تھے واپس آنے کی دعوت دی گئی ان سے باعزت زندگی کا وعدہ کیا گیا تمہاری خالہ اور ماموں بھی واپس آنے کا سوچنے لگے اگرچہ ان کے خاندان واپس آنے کو تیار نہ تھے لیکن وہ اب تک ایک کچے دھاگے سے اپنی دھرتی ماں سے جڑے ہوئے تھے۔

لیکن وہ صبح بھی صبح کاذب ثابت ہوئی۔

اس سے پہلے کہ عوام کی خواہشوں، آرزوؤں اور خوابوں کی کلیاں پوری طرح چٹکتیں۔ فوج کی بجلی ایک دفعہ پھر کوندی اور سب خواب جل بھن کر راکھ ہو گئے۔

جمہوریت کی شہزادی نے صرف انگڑائی ہی لی تھی ابھی پوری طرح جاگی نہ تھی کہ اسے مذہب اور آمریت کی نشہ آور گولیاں کھلا کر پھر سلا دیا گیا۔

اس دھرتی کی مخصوص اقلیت کو یہی منظور تھا کہ اس کی اکثریت سوتی رہے۔

چنانچہ تمہارے ماموں اور خالہ نے جو واپس آنے کے لئے پر تول رہے تھے اپنے ارادے بدل دیے۔

اس وقت مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔

ماں ہمیشہ کے لیے بچوں سے جدا ہوگئی تھی تمہارے نانا اس حادثے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک دن جب میں صبح اٹھی تو ان کی ٹھنڈی لاش کو اپنے پہلو میں پایا۔

ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں

وہ خلاؤں میں گھور رہے تھے

اپنی دھرتی کے اس خواب کی تعبیر تلاش کر رہے تھے جس کی گردن آمریت کے پنجے نے توڑ ڈالی تھی ہم نے بچوں کو اطلاع دی لیکن کوئی بھی نہ آسکا تمہارے نانا کی لاش کو اجنبیوں نے

نہلایا

کفنایا

دفنایا

ان کا جنازہ غیروں نے اٹھایا تو میں بیہوش ہوگئی

بیٹی! جب مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے بچے اب کبھی نہیں آئیں گے تو میں نے سوچا کہ ایک دفعہ میں خود ہی ان سے جا کر مل آؤں چنانچہ میں نے اپنا رخت سفر باندھا اور زندگی میں پہلی دفعہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا۔ میرا پہلا پڑاؤ یورپ تھا تاکہ میں اپنی بیٹی اور اس کے خاندان سے مل سکوں۔

میں پیرس میں تمہاری خالہ، خالو، اور بچوں سے ملی وہ بچے جنہیں اردو یا پنجابی کا ایک لفظ نہ آتا تھا اور میں فرانسیسی سے نابلد تھی۔ میری بیٹی پیرس کے ایک اسپتال میں ماہر نفسیات کے طور پر کام کر رہی تھی اس کا خاوند میرا داماد جو یونیورسٹی پروفیسر تھا ایک عزت دار آدمی تھا وہ مجھ سے بڑے خلوص سے پیش آیا۔

میں ان کے یہاں چند ہفتے رہی اور پھر انہوں نے مجھے ریل سے پورے یورپ کی سیر کرائی۔ میں نے انگلینڈ بھی دیکھا، جرمنی بھی، ہالینڈ بھی اور سکنڈ

نیویا کے ممالک بھی۔

میں نے اس سفر میں بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سیکھا۔

میں نے زندگی میں پہلی دفعہ

Gay مرد بھی دیکھے اور Lesbian عورتیں بھی

وہ لڑکیاں بھی جنہوں نے سر کے بال منڈوا دیے تھے اور وہ لڑکے بھی جنہوں نے کانوں میں بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ مزدور بھی جو دس بیس بیس کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتے تھے اور پیسہ پیسہ بچا کر گھر بھیجتے تھے تاکہ ان کی مائیں سونی دھرتی پر محل بنا سکیں۔ وہ بازار بھی جہاں نان، کباب، کلچے، کھیر، حلوا، گجریلا، حلیم، نہاری سب ملتے تھے۔

آخر میں میں نے سکنڈ ینیویا کے ممالک بھی دیکھے اور وہ بلڈنگ بھی دیکھی جہاں ہر سال دنیا کی عظیم شخصیتوں کو نوبل انعام ملتا ہے۔ میں نے جب ان شخصیتوں کی فہرست دیکھی تو مجھے تمہارے ماموں کے اس دوست کا نام بھی نظر آیا جس پر کفر کا فتویٰ لگا تھا اور جس کو قتل کرنے کے منصوبے بھی بنے تھے۔ سٹوک ہوم کی ایک محفل میں مجھے ایک سردارنی ملی۔ کہنے لگی ''ماسی تم نے مجھے پہچانا نہیں'' میں نے اسے اپنی بوڑھی آنکھوں سے غور سے دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بچپن میں ہمارے یہاں کھیلنے آیا کرتی تھی وہ اس سردار کی بیٹی تھی جو ہجرت سے پہلے ہمیں اپنی گاڑی میں چھپا کر امرتسر کے اسٹیشن تک چھوڑ آیا تھا۔

میں نے پوچھا ''بیٹی تمہارا کیا حال ہے''؟

کہنے لگی ''ماسی! بس مت پوچھو

جب سے آپ لوگ چلے گئے ہم نے بھی سکھ کا سانس نہیں لیا۔ میرے دو بھائی گولڈن ٹمپل کی جدوجہد میں مارے گئے اور دو بیٹوں کے غم سے میرا باپو بھی چل بسا۔

اب میں بھی اپنی دھرتی چھوڑ کر یہاں آبسی ہوں۔''

اس کی آنکھوں اور آواز میں اداسیوں کی پرچھائیاں تھیں۔

میں پیرس لوٹی تو تمہاری خالہ مجھے ماہرین نفسیات کی یورپی کانفرنس میں لے گئی جہاں اس نے مہاجرین کے نفسیاتی علاج، پر مضمون پڑھا جسے سب ماہرین نے سراہااور میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

یورپ سے میں پرواز کر کے اپنی دوسری بیٹی، تمہاری ماں کے پاس کینیڈا پہنچ گئی وہاں تم لوگوں نے میری بہت خدمت کی اور مجھے شمالی امریکہ کی سیر کرائی۔

میں نے نیاگرا فال بھی دیکھا۔ہالی وڈ بھی

نیویارک کا براڈوے بھی اور لاس ویگس کے کسینو بھی۔اقوام متحدہ کی وہ بلڈنگ بھی دیکھی جہاں پہلی دنیا کے نمائندے تیسری دنیا کے ممالک کے مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں۔

جہاں میں نے واشنگٹن میں دن دہاڑے چوری، ڈکیتی، زنا بالجبر اور قتل کی واردات دیکھیں وہاں یہ معجزہ بھی دیکھا کہ جب صدر الیکشن ہار جاتا ہے تو وہ نئے صدر کو مبارکباد دیتے ہوئے White House کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دیتا ہے اور پھر ملکی سیاست میں مداخلت نہیں کرتا۔کسی یونیورسٹی میں جاکر پروفیسر بن جاتا ہے یا کسی فلاحی ادارے کا مہتمم۔

میں نے شمالی امریکہ میں بہت سے ایسے وکیل،ڈاکٹر،انجینئر، بزنس مین بھی دیکھے جن کے جسم امریکہ میں تھے لیکن دل اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے تھے۔ میری کئی ایسے ادیبوں فنکاروں اور موسیقاروں سے ملاقات ہوئی جو مغرب کے فنکاروں کی صف اول میں شمار کیے جاتے تھے۔

اس سفر کے دوران بیٹی تم نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تم پنجاب، پاکستان، بنگلہ دیش اور کشمیر کی سیاحت کرنا چاہتی ہو، میرے پاس آکر رہنا چاہتی ہو تاکہ اپنے جرنلزم کی تعلیم میں اضافہ کر سکو اور میں نے تمہیں کھلے دل سے

دعوت دی تھی۔

میں بیٹیوں سے فارغ ہوئی تو اپنے بیٹے سے ملنے جنوبی افریقہ چلی گئی تمہارا ماموں جو شہر ڈربن میں مقیم ہے میں اس کے پاس جاکر ٹھہری۔ اس کی بیوی اور بچوں سے ملی۔ اس کے بچے یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ان کی دادی کو انگریزی نہیں آتی۔

اور مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میرا بیٹا کالوں کے حقوق اور آزادی کی تحریک کا سرگرم رکن تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جیسے ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم تھی اسی طرح افریقہ میں بھی انسانوں کو گوروں، کلرڈ، انڈین اور کالوں میں بانٹ دیا گیا تھا ان کی جلد کا رنگ ان کے کردار سے زیادہ اہم قرار پایا تھا۔

میرا بیٹا منڈیلا کا دست راست تھا۔ وہ اس گروہ کا ممبر تھا جس نے پچیس برس کی محنت، جدوجہد اور قربانیوں کے بعد آزادی دلائی تھی۔ جہاں وہ قید تنہائی گزارتا رہا تھا۔ وہ باغباں اب آزادی کے پودے لگا رہا تھا تاکہ کالے ووٹ ڈال سکیں اور اپنا کالا وزیر اعظم یا صدر چن سکیں۔

میں نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ وہ تو کالا نہیں تھا پھر وہ اس گروہ کا سرگرم رکن کیسے بن گیا تھا وہ کہنے لگا کہ گاندھی بھی تو جنوبی افریقہ کے باشندہ تھے جس نے ہندوستان آکر آزادی کی تحریک کو فروغ دیا تھا۔ جس دن ہندوستان نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی اسی دن ہندوستان جنوبی افریقہ کا مقروض بھی ہو گیا تھا اور اب وہ کالوں کی تحریک آزادی میں حصہ لے کر گاندھی کا قرض اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بیٹی!

جب میں جنوبی افریقہ کی سیاحت سے فارغ ہو کر اپنے دوسرے بیٹے سے ملنے سعودی عرب جا رہی تھی تو سمندر پر اڑتے ہوائی جہاز میں بیٹھی سوچ

رہی تھی کہ کسی ماں، دھرتی ماں کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے بیٹے اور بیٹیاں اپنی جن

سائنسی اور نفسیاتی تحقیقات

فنی تخلیقات

اور سیاسی نظریات

کی وجہ سے دنیا بھر میں محترم اور معتبر ہیں۔ اپنے گھر میں انہی تحقیقات کی وجہ سے ان پر کفر، تخلیقات کی وجہ سے ان پر فحاشی اور نظریات کے باعث ان پر بغاوت کے الزام اور فتوے لگتے ہیں اور ان کے بھائی اور بہنیں انہیں سنگسار کرنے پر اتر آتے ہیں۔

بیٹی!

یورپ، شمالی امریکہ اور جنوبی افریقہ کی سیاحت سے میرے دل کو جتنا سکون ملا مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت سے اتنا ہی میرا دل دکھا۔

میرے بیٹے نے اپنی روایات کو چھوڑ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنی شروع کر دی تھی، شراب جوا، عیاشی اس کے مشاغل تھے۔ کہنے لگا ماں جی!

شرافت، محبت، دیانت سب سراب ہیں جن کا اس دنیا میں کوئی فائدہ نہیں زندگی مختصر ہے اس میں جتنا عیش ہو جائے کم ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر قلق ہوا کہ عرب ایشیائی مہاجروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔

میں مسجد نبوی بھی گئی اور خانہ کعبہ بھی اور یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا کہ وہاں کے شہزادے نے اپنا گھر خدا کے گھر کے قریب بنایا ہے اور اس سے اونچا بنایا ہے اور جب خانہ کعبہ کی چادر بدلنے کے مقدس فریضے کے لیے اس کو بلایا گیا تو اس نے معذرت کر دی۔ وہ شراب کے نشے میں اتنا دھت تھا کہ سیڑھیوں میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اس دن مجھے سمجھ آئی کہ عربوں نے خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے امریکی فوجوں کو کیوں بلایا تھا مشرق وسطی کی حالت دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں بیٹے کے اصرار کے باوجود جلد واپس لوٹ آئی۔

اس سفر کے اگلے دن سے ہی میں نے خون تھوکنا شروع کر دیا تھا۔

بیٹی! میں واپس اپنی دھرتی پر پہنچی تو تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکی تھی اس بڑھاپے میں اتنا طویل اور جانگسل سفر بہت مشکل تھا۔

یہ تو اچھا ہوا کہ تم مجھ سے ملنے اور کچھ عرصہ میرے پاس رہنے کو آگئیں تم سے باتیں کرتی ہوں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

بیٹی!

میں تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں کہ تم اب تک میری کہانی سن رہی ہو۔

بیٹی!

میں جب سے لوٹی ہوں خون تھوک رہی ہوں اور ایسی بیماری کا شکار ہوں جس کا زہر میرے سراپا میں پھیل چکا ہے میں جانتی ہوں کہ میری بیماری ایسی بیماری ہے۔

جس کا کوئی نام نہیں

جس کی کوئی تشخیص نہیں کر سکتا

جس کا کوئی علاج نہیں

یہ ایسی بیماری ہے

جو زندگی کی شریانوں میں آسیب بن کر پھیل جاتی ہے۔

اور

ہر امید، ہر خوشی اور ہر دعا کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہے

بیٹی!

جب سے میں دنیا کی گردش سے لوٹی ہوں مجھے احساس ہوا ہے کہ میری

دھرتی کے مسائل دنیا بھر کی دھرتیوں کے مسائل سے مختلف نہیں۔ چاہے وہ تعصب ہو یا استحصال، چاہے وہ جہالت ہو یا نفرت، ہر طرف ان کے آسیب اور سائے پھیلے ہوئے ہیں۔

مجھے احساس ہوا ہے کہ

چاہے وہ بچے ہوں یا بوڑھے، عورتیں ہوں یا مرد، امیر ہوں یا غریب وہ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ایک ہی ماں کے جائے ہیں اور وہ ماں جہاں کہیں بھی ہو جب اپنے بچوں کو دیکھتی ہے تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

مجھے احساس ہوا ہے کہ چاہے وہ انسان ہوں یا جانور، پرندے ہوں یا مچھلیاں سب دھرتی ماں کی اولاد ہیں اور دھرتی ماں جب ان کی حالت زار دیکھتی ہے تو اس کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ بعض دفعہ وہ کپکپاہٹ اتنی شدید ہوتی ہے کہ ہم زلزلے محسوس کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ آہیں اور سسکیاں اتنی تند ہوتی ہیں کہ ہمیں آندھیاں، طوفان اور ٹورنیڈو نظر آتے ہیں۔

مجھے احساس ہوا کہ پنجاب کے بیٹے اور بیٹیاں جب تک اپنی دھرتی پر تھے اپنے راوی اور ستلج کی طرح جداگانہ شناخت رکھتے تھے لیکن جب وہ دنیا کے چاروں کونوں میں پھیل گئے تو انسانیت کے سمندر کی گہرائیوں میں اتر گئے سمندر کو گلے لگا کر دریا نجانے کیا کھوتے ہیں کیا پاتے ہیں۔

بیٹی!

مجھے احساس ہوا کہ

یہ دکھ صرف اسی صدی کے نہیں ہیں

اگلی صدی میں جب دھرتی ماں کے جگر گوشے نئی دنیاؤں کی تلاش میں چاند اور مریخ پر جا آباد ہوں گے تو دھرتی ماں ایک دفعہ پھر اداس ہو جائے گی۔

بیٹی!

تمہارے نانا فوت ہوئے تو کوئی بچہ ان کو کندھا دینے نہ آیا۔

میں تمہیں وصیت کرتی ہوں کہ جب میری موت آئے تو میری لاش کو دفنانے کی بجائے اسے جلا دینا اور پھر اس کی راکھ کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا ایک حصے کو اپنے نانا کی قبر کے پہلو میں دفنا دینا اور دوسرے حصے کو چار حصوں میں بانٹ کر دنیا کے چاروں کونوں میں میرے چاروں بچوں کو بھیج دینا۔

بیٹی!

اگر میرے بچے میرے قریب نہیں آسکتے تو مجھے ان کے قریب جانا ہوگا۔

وہ جہاں رہیں خوش رہیں
وہ زندگی اور مستقبل کی امانت ہیں
اگر میں اداس ہوں تو یہ میرا نصیبہ ہے۔
میں ان کے قریب رہوں گی تو خوش رہوں گی چاہے اس منزل تک پہنچتے پہنچتے مجھے راکھ ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

نومبر ۱۹۹۳ء

پگڈنڈیوں
پہ
چلنے والے
مسافر

وہ ایک دفعہ پھر اس پگڈنڈی کے قریب چلا آیا تھا جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اس دفعہ نہ تو وہ اکیلا تھا اور نہ ہی وہ پگڈنڈی اس حالت میں تھی جس پر اس نے اسے زمانوں پہلے دیکھا تھا۔

اسے احساس نہ تھا کہ زندگی کا سفر دائروں کا سفر تھا بچپن سے بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے بچپن تک انسان کتنے دائروں سے گزرتا ہے اسے اندازہ نہ تھا۔

جب اس نے سفر کا آغاز کیا تھا تو وہ کافی عرصے تک اس شاہراہ پہ چلتا رہا تھا جس پر اس کے خاندان کے افراد چل رہے تھے۔ انہوں نے اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ خاندان کے لوگوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے میں ہی اس کی عافیت تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اگر وہ کسی بحران کا شکار ہوا تو اس کے رشتہ دار اس کی بیساکھیوں کا کام کریں گے، اس کی حوصلہ افزائی کریں گے اور دعاؤں سے نوازیں گے۔ لیکن اس خاندان کی روایتوں میں اس کا دم گھٹتا رہتا۔ اس نے جب تازہ ہوا کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے یہی بتایا گیا کہ شکوہ و شکایت

کرنے والے زندگی میں خوش نہیں رہتے اگر اس نے ان حالات کو برداشت کرنا سیکھ لیا تو اسے ان کی عادت ہو جائے گی۔۔۔ لیکن اس کا دل نہ مانا۔۔۔۔۔۔ اس نے خاندان کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنی علیحدہ پگڈنڈی اختیار کی۔

خاندان والوں نے اسے بہت سمجھایا، جو بکری ریوڑ سے علیحدہ ہوتی ہے وہ پچھتاتی ہے لیکن وہ واپس نہ آیا۔ وہ اپنی دھن میں چلتا رہا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہ گیا تھا کہ ایک موڑ پر اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ منہ کے بل گرا۔ وہ نجانے کب تک اپنے رشتہ داروں کو بلاتا رہا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔

''ہم نہ کہتے تھے ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ''

وہ شاید وہیں دم توڑ دیتا اگر ایک اجنبی مہربان اس کی مدد کو نہ آتا۔ وہ اجنبی بھی اپنے خاندان کی شاہراہ چھوڑ کر اس پگڈنڈی پہ سفر کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ہمت بندھاتے آگے بڑھتے رہے۔ انہیں اس سفر کی رفاقت نے دوستی کے ایک ایسے رشتے میں جوڑ دیا تھا جو خون کے رشتے کی بہ نسبت زیادہ مستحکم تھا۔

وہ دونوں چلے جا رہے تھے کہ ان کی پگڈنڈی ایک اور شاہراہ کے قریب سے گزری جس پر ان کی قوم کے افراد چل رہے تھے۔ اس قافلے کے ہمناؤں نے ان دو تنہا مسافروں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں اس قافلے کے ساتھ چلنے لگے وہ ابھی زیادہ دور نہ گئے تھے کہ انہوں نے پوری قوم کو اپنی روایات کی عظمت اور مقدس کے گیت گاتے سنا۔

جب ان دونوں دوستوں کو احساس ہوا کہ وہ ایسی قوم کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے جہاں ماضی کے بتوں کی پرستش کی جاتی ہے تو وہ دوبارہ اپنی پگڈنڈی کی طرف لوٹ آئے۔

اس دفعہ بھی قوم کے افراد نے انہیں ان ہی چیزوں سے ڈرایا جن سے ان کے خاندانوں نے ڈرایا تھا لیکن وہ نہ مانے اس دفعہ تو وہ تھے بھی دو۔

لیکن وہ ابھی اس پگڈنڈی پر زیادہ دیر نہ چلے تھے کہ ایک جنگل میں راستہ کھو بیٹھے۔ انہوں نے بہت چیخیں ماریں۔ انھیں امید تھی کہ ان کی قوم کے مرد اور عورتیں انہیں بچانے آئیں گے لیکن جنگل میں ان کی چیخوں کی آواز گونجتی رہی لیکن کوئی ہمدرد آواز نہ آئی۔ آخر انہیں کسی اور قوم کے چند مرد اور عورتیں مل گئے جنھوں نے اپنی حفاظت کے لئے خیمے لگا رکھے تھے اور ان کے چاروں طرف جانوروں سے بچنے کے لئے آگ جلا رکھی تھی۔ وہ لوگ بھی اپنی قوم کو چھوڑ کر اس پگڈنڈی پہ نکل آئے تھے۔ وہ اجنبی مہربان ان دونوں دوستوں کو اپنے خیموں میں لے گئے۔

اگلے دن وہ سب مل کر دوبارہ اس پگڈنڈی پہ چلنے لگے اس پگڈنڈی پہ چلتے چلتے وہ ایک اور شاہراہ کے قریب سے گزرے، جس پر اس زمانے کا ایک قافلہ چلا جا رہا تھا اس قافلے نے اس گروہ کو اپنی شاہراہ کی طرف بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ لوگ اپنی دھن میں مست اپنی پگڈنڈی پہ چلتے رہے۔

اس بات کو زمانے بیت گئے لیکن اب جو وہ اپنے بڑھاپے میں دوبارہ اس پگڈنڈی کے قریب سے گزرا جہاں سے اس نے بچپن میں سفر کا آغاز کیا تھا تو اسے یہ دیکھ کر حیرانگی ہوئی کہ وہ پگڈنڈی بذات خود ایک شاہراہ بن چکی تھی۔

جولائی ۱۹۹۱ء

چند گز
کا
فاصلہ

ہم لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے لیکن اب کہانی سنانے کو صرف چند سو باقی رہ گئے ہیں۔ ''کیا ہم خوش قسمت ہیں کہ ابھی تک زندہ ہیں یا بد قسمت کہ مرنے والوں کا سوگ منا رہے ہیں؟'' ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں۔

ہماری ماؤں نے ساری دنیا میں سمندر سے چند گز کے فاصلے پر لاکھوں انڈے دیے تھے۔ انھیں امید تھی کہ ہم وہ مختصر سا فاصلہ طے کرلیں گے لیکن اس مختصر سے فاصلے کو طے کرتے کرتے ہمیں ایک طویل مدت لگی اور لاکھوں جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ اب ہم واپس اس جگہ پر آگئے ہیں جہاں سے ہماری ماؤں نے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ جب ہماری ماؤں نے انڈے دیے تھے تو انھوں نے ہمیں ریت میں چھپا دیا تھا تاکہ ہم انسانوں، جانوروں اور پرندوں کی نظروں سے اوجھل رہیں لیکن ایسا نہ ہوا ہم حوادث کا شکار ہوگئے۔ ہم میں سے جو آج تک زندہ ہیں شاید خوش قسمت ہیں کہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لینے اور اپنی کہانی سنانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

ہماری ماؤں نے ریت کھودی تھی اور انڈے دیے تھے تاکہ ہم زیر

زمین محفوظ رہیں لیکن ہمارے انسانی ہمسایے ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور آخر انہوں نے ہمیں کھود نکالا۔ انہوں نے انڈوں سے اپنی جیبیں اور تھیلے بھر لئے اور بازاروں کی طرف چل دیے۔ اگر وہ مڑ کر دیکھتے تو انھیں ہماری ماؤں کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے۔ ہماری ماؤں کو پتہ تھا کہ وہ انڈے بازاروں میں بیچ دیے جائیں گے۔ بہت سی انسانی مائیں اپنے بچوں کو وہ انڈے کھلائیں گی تاکہ بچے صحت مند ہوں لیکن بعض مرد انہیں یہ سوچ کر کچا پی جائیں گے کہ اس سے ان کی شہوانی طاقت میں اضافہ ہوگا۔ شہوانی طاقت میں اضافہ ایک حقیقت ہے یا خوش خیالی ہمیں کیا معلوم۔ ہماری تلاش میں صرف انسان ہی نہ تھے۔ پرندے بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تیز اور نوکدار چونچوں اور پنجوں سے ریت کھود کر انڈے نکالے تھے اور انہیں توڑ کر پی گئے تھے۔ انہوں نے تو اپنی بھوک تیز کرنے کیلئے ایک دل لگی کا سہارا لیا تھا لیکن ہم اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے۔

جب انڈوں سے بچے پیدا ہو گئے تو سب بچوں کی ایک ہی خواہش تھی اور ایک ہی منزل۔ وہ سب پانی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ وہ چند گز کا فاصلہ طے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ چند گز کا فاصلہ سینکڑوں رکاوٹوں سے اٹا پڑا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ ہم میں سے کتنے کامیاب ہوں گے اور کتنے راستے میں قربان ہو جائیں گے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں ہمارے قد، جسامت اور شکلیں مختلف تھیں۔ ہم میں سے بعض اتنے چھوٹے تھے کہ بچے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیں اور بعض اتنے بڑے کہ نوجوان مرد بھی نہ اٹھا سکیں۔ ہم میں سے اکثر اپنی حفاظت کے لئے ایک ڈھال پہنے رہتے تھے لیکن اس ڈھال کے نیچے ہمارے ناتواں جسم کانپتے رہتے تھے۔ جب ہم نے سمندر کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور پانی کی طرف رینگنا شروع کیا تھا تو ہم لاکھوں کی تعداد میں تھے۔

اس سفر میں ہمارے پہلے دشمن آبی پرندے تھے جو چٹانوں پر ہمارے

انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ جب ہم رینگنا شروع کرتے تو وہ خوشی سے چیخنا اور چلانا شروع کر دیتے تھے اور ہم پر حملہ آور ہو جاتے۔ ہم ان سے بہت چھوٹے تھے اس لئے ان کے رحم وکرم پر تھے۔

ہم میں سے جو آبی پرندوں سے بچ گئے تھے ان پر چھپکلیاں حملہ آور ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی زہریلی زبانوں سے ہمیں چاٹنا شروع کر دیا تھا وہ ہم سے اتنی بڑی تھیں کہ ہم ان کے آگے مجبور و بے بس تھے۔ وہ ہم میں سے بہت سوں کو زندہ کھا گئی تھیں۔

ہم میں سے جو پرندوں اور چھپکلیوں سے بچ گئے تھے وہ کیکڑوں کی زد میں آگئے تھے۔ اگرچہ ان کی شکلیں گھناؤنی تھیں لیکن ہم پھر بھی ان سے دست و گریباں ہو گئے تھے کیونکہ وہ اتنے طاقتور نہ تھے۔ ان کے ساتھ ہماری رسہ کشی کافی دیر تک جاری رہی۔ وہ ہمیں پانی سے دور کھینچتے اور ہم انھیں سمندر کی طرف ڈھکیلتے۔ بعض دفعہ یہ زندگی اور موت کا رقص کئی گھنٹے جاری رہتا اور جانبین نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ کبھی وہ چند لمحوں کیلئے کامیاب ہوتے لیکن پھر تھک جاتے اور کبھی ہم چند لمحوں کے لئے کامیاب ہوتے اور پھر تھک جاتے۔

اگرچہ اس جدوجہد میں ہمت ہار جانا آسان تھا لیکن ہمیں اپنی استقامت کا پاس تھا جو دنیا بھر میں مشہور تھی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ لوک کہانیوں میں جب ہمارا مقابلہ خرگوشوں سے ہوا تھا تو خرگوش تیز رفتار ہونے کے باوجود ہار گئے تھے اور ہم اپنی سست روی کے باوجود دوڑ جیت گئے تھے۔ کیکڑوں کے ساتھ ہماری جنگ طویل جنگ تھی۔ بعض محاذوں پر ہم ہار گئے تھے اور بعض محاذوں پر ہم جیت گئے تھے۔ بعض دفعہ ہم نے ایک دشمن کو ہرا دیا تھا لیکن دوسرے دشمن کی زد میں آگئے تھے۔ ہمارا سب سے بڑا دفاع ہماری تعداد تھی۔ ہم اتنے زیادہ تھے کہ مٹھی بھر انسان، پرندے، چھپکلیاں اور کیکڑے مل کر بھی ہمیں ختم نہ کر سکے تھے۔

ہم میں سے بعض چند گز کا فاصلہ طے کر کے پانی کے اتنے قریب آگئے تھے کہ انہیں سمندر کی لہر اپنی طرف آتی دکھائی دی تھی اور وہ چند لمحوں کے بعد منزل سے ہم آغوش ہو جاتے کہ عین اسی لمحے کسی پرندے نے اپنے پنجوں سے انہیں اچک لیا تھا۔ اور منزل کا سہانا خواب پل بھر میں ڈراؤنا خواب بن گیا تھا۔ ایسی صورت میں ہم اپنے ستاروں کو دوش نہ دیتے تو اور کیا کرتے۔ ہم میں سے جو خوش قسمت تھے وہ پرندوں کے پنجوں سے پھسل گئے اور سمندر سے خود ہی آگے بڑھ کر گلے مل گئے۔

ہم میں سے چند ایک اتنے بدقسمت تھے کہ جب ہماری بھاری بھر کم ماؤں نے سمندر کی طرف سفر شروع کیا تو ہم ان کے جسموں تلے روندے گئے ہم وقت پر ادھر ادھر نہ ہو سکے اور مارے گئے۔

ہم میں سے جو سمندر تک پہنچ گئے انہوں نے کچھ سکھ کا سانس لیا لیکن بعض کو احساس ہوا کہ وہاں بھی ہم اتنے محفوظ نہ تھے جتنی ہمیں امید تھی۔ ہم میں سے بعض کو مچھلیوں نے نگل لیا لیکن ہم میں سے وہ جو خوش قسمت تھے اور اپنے دشمنوں کی زد سے بچ کر نکل آئے تھے وہ زندہ رہے۔

اب ہم جوان ہو گئے ہیں اور اپنی ماؤں کی روایت اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے دوبارہ سمندر سے چند گز کے فاصلے پر آگئے ہیں تاکہ ریت کھود سکیں اور انڈے دے سکیں۔

اور اس نسلوں کے سفر کو چند قدم اور آگے بڑھا سکیں اور اس دکھ سکھ بھری داستان کا نیا باب تحریر کر سکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو سو انڈے دینے ہونگے تاکہ ان میں سے کم از کم ایک تو جوانی کی حدود تک پہنچ سکے، چند گز کا فاصلہ طے کر سکے اور کہانی سنانے کے قابل ہو سکے۔

ہم میں سے بعض پر امید ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارے انسانی ہمسائے اب باشعور ہو گئے ہیں اور ہمارے دوست بن گئے ہیں۔ وہ اب ہمارے ساتھ مل

جل کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے انسانی دوست اس بات کا اہتمام کریں کہ ہمارے انڈوں کو محفوظ کرلیں اور انہیں ایسی فضا میں رکھیں جہاں انڈوں سے بچے پیدا ہوں تو وہ دشمنوں کی زد میں نہ آئیں اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں سینکڑوں انڈے دینے کی ضرورت نہ رہے گی اور ہم بھی انسانوں کی طرح صرف ایک یا دو انڈے دے سکیں گے اور یقین رکھیں گے کہ ہمارے بچے زندہ رہیں گے اور مسکراتے ہوئے جوان ہوں گے لیکن ہم میں سے چند ایک طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ تم انسانوں کو دیکھو ان میں بھی کتنا فرق ہے۔ پہلی دنیا کے انسان تو ایک یا دو بچے پیدا کرتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان کے بچے محفوظ ماحول میں جوان ہوں گے اور کامیاب زندگی گزاریں گے لیکن تیسری دنیا کی مائیں تو درجنوں بچے جنتی ہیں تاکہ ان میں سے چند ایک زندہ رہیں اور وہ چند گز کا فاصلہ طے کرسکیں جو ان کے گھروں، اسکولوں، کارخانوں اور دفتروں کے درمیان حائل ہے۔ وہ چند گز کا فاصلہ جو بعض دفعہ کئی نسلوں میں طے ہوپاتا ہے۔

مارچ ۱۹۹۲ء

ہمزاد

میں آج آپ سے آخری بار ملنے آیا ہوں اور اگر یہ کہوں تو زیادہ سچ ہوگا کہ ملنے آئی ہوں۔

آپ ماہر نفسیات ہیں اور میں ایک مریض اور اس ملاقات کا وقت میرا ہے۔ آپ خود ہی کہا کرتی ہیں کہ میں اس وقت کو جس طرح چاہے استعمال کروں۔ جس موضوع پر چاہے تبادلۂ خیال کروں۔ جس مسئلے کو چاہے چھیڑوں اور اگر خاموش رہنا چاہوں تو یہ بھی میرا اختیار ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ آپ مذاق کر رہی ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ سچ کہتی ہیں۔ آپ ہمدرد ہیں اس لئے میں بار بار آپ سے ملنے آتا ہوں اور اسی لیے آج بھی ملنے آیا ہوں۔ آج میرا جی چاہتا ہے کہ اس ملاقات میں میرے جی میں جو کچھ آئے کہہ دوں اور آپ بس سنتی رہیں۔ نہ مجھے کوئی مشورہ دیں اور نہ نصیحت کریں۔ میں مشوروں اور نصیحتوں سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔

میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں موت کا خیال زندگی کے تصور سے زیادہ حسین نظر آتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ میری گفتگو کے دوران

مجھے روکیں یا ٹوکیں۔ میرے جی میں جو آئے، میرے دل میں جو آئے، میرے دماغ میں جو آئے، مجھے کہنے دیجئے۔ پہلی اور آخری بار مجھے سب کچھ کہہ لینے دیجئے۔ مجھے دل کا سارا غبار، ساری بھڑاس، سارا درد نکال لینے دیجئے۔ آپ میری Therapist ہی نہیں انسان بھی ہیں۔ آپ مجھے برسوں سے جانتی ہیں۔ میں ہر ماہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور اپنی دکھ بھری کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں آپ تحمل سے سنتی رہتی ہیں لیکن نہ تو آپ کچھ کرسکتی ہیں اور نہ میں کچھ کرسکتا ہوں اس لیے کیوں نہ آج اس حقیقت کا اقرار کرلیں کہ ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔

اگر آج میری زبان لڑکھڑا جائے یا خیالات بے ترتیب ہو جائیں یا موضوعات بدل جائیں تو معاف کر دیجئے گا۔ انسان جذباتی ہو جائے تو پریشان خیالی بھی در آتی ہے لیکن یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ اگر زندگی پریشان ہو تو اس کا اثر جذبات اور خیالات پر بھی پڑتا ہے۔

آج آپ بس سنتی رہیں ایک دوست کی طرح، ایک ہمدرد کی طرح، کیونکہ میری زندگی میں آپ واحد انسان ہیں جسے میں اپنا غمخوار سمجھتا ہوں اور اب میں اپنی ساری کہانی آخری بار سنا دینا چاہتا ہوں۔ ایسی کہانی جس کا نہ تو کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ جو نجانے کہاں سے شروع ہوئی تھی اور نجانے کہاں ختم ہوگی۔

میری زندگی اون کا وہ گچھا ہے جسے کسی بلی نے کھیلتے کھیلتے الجھادیا ہو۔

آپ بس میری باتیں سنتی رہیں اگر بور بھی ہو جائیں تو برداشت کرلیں۔ انسانی زندگی کے بعض حصے بورنگ بھی ہوتے ہیں لیکن ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں جیسے زندگی میں بورنگ دوست اور بورنگ رشتہ داروں سے بھی نباہ کرنا پڑتا ہے۔

پچھلے کئی سالوں سے آپ کی ہمدردی، حوصلہ افزائی اور مدد کے باوجود

میری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ میری زندگی دلدل کی طرح ہے جتنا اوپر کی طرف جانا چاہتا ہوں اتنا اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہوں۔ اس لیے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اوپر اٹھنے اور باہر نکلنے کی سعی ہی بیکار ہے۔ جب تباہ ہونا ہی ٹھہرا تو آج تباہ ہوئے یا کل۔ جب میں آپ سے ملا تھا تو میرا ایک گھر بھی تھا اور میری ملازمت بھی تھی لیکن میں پریشان تھا۔ غمزدہ تھا آج برسوں کی ریاضت کے بعد ناامیدی کا تو وہی حال ہے بلکہ بڑھ گئی ہے۔ اب نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ کوئی ملازمت۔ میں ایک Basement Apartment میں رہتا ہوں۔

اکیلا، تنِ تنہا، جیسے حشرات الارض، سردیوں میں زیرِ زمین، مہینوں گزار دیتے ہیں لیکن انہیں تو موسم گرما آنے کی امید ہوتی ہے۔ مجھے تو وہ امید بھی نہیں رہی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ مسکرا رہی ہیں۔ آپ کی مسکراہٹ میں شفقت کے ساتھ ساتھ قدرے طنز بھی ہے۔ آپ کبھی کبھار سمجھتی ہیں کہ میں اپنا غم بیان کرتے کرتے شاعرانہ انداز اختیار کر لیتا ہوں یا اس میں افسانویت پیدا کر دیتا ہوں لیکن یہ خوشی سے نہیں مجبوری سے ہوتے ہیں کیونکہ الفاظ انسانی غم کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتے اس لیے ہم تشبیہوں اور استعاروں کی بیساکھیاں ڈھونڈ کے لاتے ہیں تاکہ اس کے سہارے چند قدم اور چل سکیں۔

میں آج آپ کو اس لیے بھی اپنی کہانی سنا رہا ہوں کیونکہ آپ نے کہا تھا کہ ماہر نفسیات ہونے کے ناطے آپ مریضوں کی کہانیوں کا ریکارڈ رکھتی ہیں۔ میری بھی خواہش ہے کہ میری بپتا بھی کہیں رکارڈ ہو جائے۔ نجانے مجھ سے پہلے اس دنیا میں مجھ جیسے کتنے آئے اور گزر گئے اور کچھ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ اگر میں کوئی ادیب یا فنکار ہوتا تو اپنی سوانح خود ہی لکھ لیتا، لیکن میں ایک مظلوم و مجبور انسان ہوں جس کے پاس نہ دولت ہے نہ وسائل اور نہ ہی Talent۔ اگر Talent ہے بھی تو کسی نقطے پر مرکوز نہیں۔ انسانی صلاحیتیں بھی تو سورج کی شعاعوں کی طرح

ہوتی ہیں اگر ایک نقطے پر مرکوز نہ ہوں تو آگ نہیں پیدا کرسکتیں۔ میرا یہ خیال تھا کہ شاید آپ کی ذات میرے لیے محدب عدسے کا کام کرے گی لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا آج میں اپنے رشتے کا ماتم بھی کرنے آیا ہوں کیونکہ آج کے بعد ہمارا رشتہ بھی نہ رہے گا۔ میں نہ رہوں گا تو میرے سارے رشتے بھی نہ رہیں گے وہ ایک دن تو ختم ہونے ہی تھے آج نہیں تو چند مہینے بعد سہی۔ میں نے کسی دکھی شاعر کا شعر پڑھا تھا۔

میں آج مرتا کہ دو چار دس مہینے بعد
یہ سانحہ تو بہر حال ہونے والا تھا

اب میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہرے پر بھی غم کے آثار نمودار ہو رہے ہیں میں جانتا ہوں کہ آپ بھی میرے دکھ میں شریک ہیں لیکن ساتھ ہی بے بس بھی ہیں۔ ایک انسان آخر کب تک دوسرے انسان کو تسلیاں دیتا رہے۔ موت کا ہاتھ زندگی کے ہاتھ سے زیادہ مضبوط رہا ہے۔ زندگی موت کے دو لمحوں کے درمیان طویل یا مختصر سفر کا ہی تو نام ہے۔ آپ کہیں گی کہ آج کچھ زیادہ ہی قنوطی ہوگیا ہے۔ کبھی کبھار تو مزاح بھی پیدا کیا کرتا تھا۔ مزاح جو ایک ایسا ہتھیار ہے جو موت کے خلاف بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ موت، عقل اور دلیل کی نسبت مزاح سے زیادہ ڈرتی ہے اور عارضی طور پر پسپا ہوجاتی ہے۔ بہر حال میرا خیال ہے اسی لیے مزاح نگار در حقیقت اندر سے بہت غمگین ہوتے ہیں۔

میں ذرا پانی کے چند گھونٹ پی لوں کیونکہ آج بہت سی باتیں کرنی ہیں اور آپ کو سننی ہیں۔

مجھے وہ سہ پہر بخوبی یاد ہے جب پہلی دفعہ میں آپ سے ملنے آیا تھا۔ میں کسی ماہر نفسیات سے پہلے کبھی نہ ملا تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ ماہر نفسیات ہوتے کون ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ Psychologist اور Psychiatrist

میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ماہر نفسیات کے لفظ کے ساتھ جو واحد تصور ابھرتا تھا وہ ہپناٹزم کا تھا۔ آپ کے پاس آنے کا مشورہ مجھے میرے گاؤں کے ڈاکٹر نے دیا تھا شاید اس کا علم اور تجربہ میرے غم اور کیفیت کے آگے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔ وہ بیچارا کرتا بھی کیا۔ وہ بھی مجبور تھا۔ وہ تو سارا دن نزلہ 'زکام' کھانسی اور بخار کا علاج کیا کرتا تھا۔ میرے مصائب و آلام کے ساتھ اس کا واسطہ پڑا تو گھبرا گیا اسے دیکھ کر مجھے ترس بھی آتا۔ وہ مجھے اس بچے کی طرح لگتا جسے ٹینس کی گیند کے ساتھ کھیلتے کھیلتے فٹ بال مل جائے اور اسے سمجھ نہ آئے کہ اس سے کیسے کھیلے۔

شروع میں تو اس نے میری بہت مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ میں نے ہی تو اسے اپنے دل کا پورا حال نہ سنایا تھا کیونکہ میں اپنے راز اپنے آپ سے بھی چھپائے پھرتا تھا۔ میری بیوی نے میری حالت ناگفتہ دیکھ کر ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور میرے لیے Appointment لی تھی اور میں اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ میں سارا راستہ سوچتا رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔

بہر حال وہ سوال پوچھتا رہا اور میں جواب دیتا رہا۔ اس کے سوال بھی سطحی تھے میرے جواب بھی۔ کسی سے صحیح سوال پوچھنا جواب دینے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ آج تک شاید انسان نے سوال پوچھنے کا فن نہیں سیکھا۔ اگر کسی سنار سے کوئی لوہار بیسیوں سوال بھی پوچھ لے تو سونے کی حقیقت نہ جان پائے گا۔ میرے ڈاکٹر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے میری جسمانی صحت، میری بھوک، میری خوراک اور میرے وزن کا زیادہ خیال تھا۔ آخر میں کہنے لگا کہ تمہیں Depres-sion کی بیماری ہے۔ پھر اس نے مجھے کسی طبی کتاب کے چند اوراق پڑھ کر سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ ذہن کے خلیوں میں جب چند کیمیائی مادے کم ہوتے ہیں تو انسان Depress ہو جاتا ہے اور اس کا علاج ایسی ادویہ سے کیا جاتا ہے جو

Anti-Depressents کہلاتی ہیں۔ اس نے مجھے دو ہفتے کا نسخہ لکھ کر دیا۔ پہلی رات ایک گولی، دوسری رات دو، تیسری رات تین اور پھر ہر رات چار۔ میں نے چند دن تو وہ گولیاں کھائیں لیکن جب میرے ہونٹ خشک، آنکھوں کے آگے اندھیرا اور جسم پر رعشہ طاری ہونے لگا تو میں نے وہ گولیاں کھانی بند کر دیں۔ ڈاکٹر کہنے لگے وہ Side Effect ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اگر بہتر نہیں ہو سکتا تو کم از کم بدتر تو نہ ہوں۔ میں نے دوائیاں کھانی بند کر دیں لیکن ڈاکٹر کو نہیں بتایا۔

آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میں بہت نادان تھا کیونکہ میں اپنی امید کو اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ امید سادگی، بیوقوفی یا تجربہ کاری کا ہی دوسرا نام ہے۔

جب چند ہفتوں کے علاج کے بعد، میرے کرب میں جسے ڈاکٹر نے اپنی سہولت کے لیے Depression کا نام دے رکھا تھا کچھ کمی نہ آئی تو وہ پریشان ہوا۔ اس کے بعد اس نے جب میری زندگی کو ذرا گہرائی سے جاننا چاہا تو اسے اندازہ ہوا کہ میں اور میری بیوی ایک ہی گھر میں دو ہمسایوں کی طرح رہتے تھے۔

کہنے لگا تمہاری ڈیپریشن کی وجہ ازدواجی کشیدگی ہے پھر اس نے میری بیوی کو بلایا اور تفصیلاً گفتگو کی۔ وہ بھی اسی ڈاکٹر کا حوصلہ تھا کہ باہر مریض بیٹھے رہتے اور وہ ہماری کہانیاں سنتا رہتا۔ آخر جب اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ملاقات ایسے دو انسانوں سے ہوئی ہے جو ایک دوسرے سے محبت تو کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ رہ نہیں سکتے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہماری جنسی زندگی نہ ہونے کے برابر ہے تو کہنے لگا کہ تم نامرد Impotent ہوتے جا رہے ہو اور چونکہ نامردی کی بیشتر اوقات وجہ نفسیاتی ہوتی ہے اس لیے تمہیں کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیے چونکہ اس گاؤں میں کوئی ماہر نفسیات نہ تھا اسلیئے اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔ دراصل اس طرح وہ خود چین کی نیند

سونا چاہتا تھا۔

میں جب بس میں بیٹھا پہلی دفعہ آپ سے ملنے آیا تو میں نے سوچا کہ بیچارے ڈاکٹر کا بھی کیا قصور۔ جب تک میں خود اپنے دل کا حال نہ بتاؤں گا ڈاکٹروں کو کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔ وہ کوئی خدا تو ہیں نہیں کہ دلوں کا حال جانیں ویسے یہ خدا کا نام میں نے عادتاً لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر واقعی خدا ہوتا تو انسانوں کے دلوں کا حال ایسا نہ ہوتا۔ بہر حال میں نے بس میں آتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو صاف صاف دل کا حال سناؤں گا کیونکہ اس وقت تک میرا ایمان تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ آپ بھی مجھے نامرد ثابت کر دیں۔ میں خود ہی کیوں نہ آپ کو بتا دوں کہ میں ایک عورت ہوں۔

آپ سے مل کر میں بہت خوش ہوا تھا۔ آپ کے لہجے کی متانت اور چہرے کی مسکراہٹ مجھے بہت پسند آئی تھی اور اس دن کے بعد میرے ذہن میں ماہر نفسیات کے الفاظ کے ساتھ ہپناٹزم کی بجائے مہربان آنکھوں اور شفیق چہرے کا تصور پیدا ہونے لگا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ آپ نے کیا سوال پوچھے اور میں نے کیا جواب دیے لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں نے حال دل سنایا اور آپ نے حال دل سنا۔

میں نے آپ کو صاف صاف بتا دیا کہ میں ایک عورت ہوں لیکن مرد کے جسم میں محصور ہوں۔ میرے اندر کی عورت باہر آنا چاہتی ہے۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔ وہ آزاد ہونا چاہتی ہے لیکن میرا جسم، وہ قید خانہ ہے، وہ کوٹھری ہے، وہ قبر ہے، جس نے اسے زندہ درگور کر رکھا ہے۔ چونکہ میں نے پہلے کبھی کسی کو سچی کہانی نہ سنائی تھی اس لئے میرے الفاظ لڑکھڑا لڑکھڑا گئے تھے لیکن آپ نے نہ مجھے ٹوکا تھا نہ روکا تھا۔ جیسے آج آپ خاموشی سے سن رہی ہیں اور میں اپنی بپتا سنا رہا ہوں۔

میں نے پہلی دفعہ کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنی عورت کو ننگا کیا تھا۔

آپ سنتی رہیں اور بڑی دیر تک سنتی رہیں آخر میں آپ نے کہا کہ آپ کے دو رفیق کار، دو Psychologist بھی میرا انٹرویو لیں گے، کچھ ٹیسٹ دیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے چیف کے ساتھ ملوں گا۔ اس دن مجھے سائیکالوجسٹ اور سائیکاٹرسٹ کے فرق کا پتہ چلا تھا۔ آپ نے کہا کہ معاملہ پیچیدہ ہے لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں۔ آپ مجھ سے پہلے مجھ جیسے کئی مریضوں کا علاج کر چکی ہیں۔

میں نے پہلے تو سوچا کہ اس مرضِ لا علاج کا کیا علاج ہو سکتا ہے لیکن بہر حال خاموش رہا۔ اپنی کم فہمی اور لا علمی پر انکسار کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔

پہلی ملاقات کے بعد، جب میں بس میں واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں آپ کو بہت سی باتیں بتانا بھول گیا تھا۔ آخر ایک ملاقات میں ایک پریشان خیال انسان کیا کیا بتا سکتا ہے۔ اگر ایک زخم ہو تو انسان دکھائے اور جب سراپا جسم ہی زخم بن جائے تو کوئی کیا کرے۔ باقی باتوں کے علاوہ مجھے ایک خواب بار بار یاد آرہا تھا جو میں بتانا بھول گیا تھا۔

میں نے کئی دفعہ دیکھا تھا کہ میں ایک صحرا، لق و دق صحرا میں بھاگا، سرپٹ بھاگا جا رہا ہوں اور بہت سے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں صرف ان کی آوازیں سن سکتا ہوں۔ میں نہ تو انہیں دیکھ سکتا ہوں اور نہ ہی مڑ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے جب میں نڈھال ہو جاتا ہوں۔ تو مجھے اپنے سامنے ایک گنبد نظر آتا ہے لیکن بغیر دروازے کے۔ میں جب اس کے گرد چکر لگاتا ہوں تو اس کے عقب میں ایک دروازہ ابھرتا ہے اور میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میرے داخل ہوتے ہی دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔ میں اس گنبدِ بے در میں محفوظ محسوس کرتا ہوں اور سکھ کا سانس لیتا ہوں۔ میرا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کی آوازیں آنی بند ہو جاتی ہیں لیکن پھر ایک اور آواز ابھرتی ہے۔ ایک نسوانی

آواز سرگوشی کے انداز میں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ گنبد بے در آسیب زدہ ہے جس میں میں اور وہ نسوانی آواز ہمیشہ کے لیے محصور کر دیے گئے ہیں۔ میں چیخنے لگتا ہوں اور میری نیند کھل جاتی ہے۔ میں اپنے سراپا کو پسینے میں شرابور پاتا ہوں۔

گھر پہنچا تو میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اسے میں نے انٹرویو کی تفاصیل تو نہ بتائیں لیکن اتنا ضرور بتایا کہ مجھے ایک ہمدرد Therapist مل گیا ہے۔ جس نے مجھے امید دلائی ہے۔ میری بیوی کی بھی امید بندھی لیکن وہ بھی میری نادانی تھی۔ کسی انسان کو امید دلانا اسے تین منزلہ مکان کی چھت پر کھڑا کرنے کی طرح ہے۔ ایسی چھت جس پر بہت زیادہ پھسلن ہو۔ جہاں سے وہ جلد یا بدیر گر پڑتا ہے اور پھر اس کا صحیح سلامت بچ جانا یا ہڈی پسلی تڑوا دینا اس کی قسمت پر منحصر ہوتا ہے۔ مجھے اپنی بیوی پر پیار بھی آتا اور ترس بھی۔ وہ ایک مخلص عورت اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پلی بڑھی تھی جہاں ہر شخص خوف کی چادر اوڑھے زندہ رہتا تھا۔ اس کا باپ Alcoholic تھا اور گالی گلوچ سے مار پیٹ تک سب جائز سمجھتا تھا۔

اس لئے اس کے گھر والے اپنے گھر بھی کم ہی آتے تھے اور اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ میری بیوی پیار کو ترسی ہوئی تھی۔ اس لیے جب مجھ سے ملی تو ایسے جیسے کسی صحرانورد کو مدتوں کی مسافت کے بعد شیریں پانی کا چشمہ مل جائے۔ وہ مجھ سے پہلی دفعہ گلے ملی تو کہنے لگی کہ میں پانچ سال کے بعد کسی سے گلے ملی ہوں لیکن وہ بھی کیا سادہ تھی اور میں بھی کیا سادہ تھا کہ یہ جانتے ہوئے کہ قربتیں، فرقتوں کی تمہید ہوتی ہیں اس نے مجھے اپنی زندگی کا سارا حال سنا دیا۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن سب کچھ سنانے کے بعد بھی وہ نہ بتا سکا جو بتانا چاہیے تھا۔

آخر برسوں کے بعد بھی آپ کو دل کا حال سنا دیا اسے نہ بتا سکا۔

میں ساری رات تکیے میں منہ چھپائے روتا رہا۔ اپنی بے وفائی پر۔ اپنی

بیوی سے اپنے آپ کو چھپانے پر۔ لیکن آنسو برسوں کی ناانصافیوں کا ازالہ کہاں کرتے ہیں۔ وہ تو بس دل کو تسلی دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی سے جب بھی پوچھا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر کیوں نہیں چلی جاتیں تو وہ کہتی ''میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ویسے بھی نہ تم مجھے گالیاں دیتے ہو، نہ مارتے پیٹتے ہو، نہ شراب پیتے ہو نہ جوا کھیلتے ہو''۔ وہ ہر دفعہ اپنا مقابلہ اپنی ماں سے اور میرا مقابلہ اپنے باپ سے کرتی اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی۔ لیکن وہ بھی تو ناانصافی تھی۔ میں اسے سمجھاتا کہ میں اسے کوئی خوشی نہیں دیتا اور بیماری کی عدم موجودگی کو صحت نہیں کہتے۔ نہ اس میں مجھے چھوڑنے کی ہمت تھی، نہ مجھ میں بھاگ جانے کا حوصلہ۔ اس لئے ہم ان دو پرندوں کی طرح تھے جو اپنی مرضی سے پنجرے میں قید تھے۔ دروازہ کھلا تھا لیکن ہم پھر بھی محصور تھے۔ ظلم یہ کہ ہم کسی پر الزام بھی تو نہ دھر سکتے تھے اور پھر الزام تراشی سے ملتا بھی کیا ہے۔

ہم برسوں اپنی تنہائیوں کے صحرا میں پھرتے رہے یہاں تک کہ ہمارے بستر پر Cactus اُگ آئے اور ہم علیحدہ علیحدہ خواب گاہوں میں سونے لگے۔ میرے شہوانی جذبات آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے اور صرف کرسمس یا ایسٹر (Easter) پر ہم بستری کرتے۔ جیسے تشنج زدہ رشتہ دار عید، بقرعید پر گلے ملتے ہیں۔ مجھے ان لمحوں میں احساس ہوتا رہا کہ زندگی میں، ہیلو کہنا کتنا آسان ہے اور الوداع کہنا، کتنا مشکل۔ رشتہ جوڑنا آسان ہے، رشتہ توڑنا مشکل۔ لیکن وہ تو برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب تو میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کو الوداع کہنے آیا ہوں لیکن پھر بھی یہ کڑوا گھونٹ پینا مشکل ہے اسی لیے میں اتنی باتیں کر رہا ہوں۔ ویسے تو میں کسی لمحے بھی اٹھ کر رخصت حاصل کر سکتا ہوں لیکن نہیں۔ انسان کو الوداع بھی ڈھنگ سے کہنا چاہیے کیونکہ بعض دفعہ الوداع کا لمحہ ذہنوں کے کینوس پر نقش ہو جاتا ہے اور برسوں یاد رہتا ہے۔ مسئلہ صرف میرا اور میری بیوی کا بھی نہ تھا۔ اس پورے گاؤں کا تھا جس میں میں جوان ہوا تھا۔ سارا گاؤں

ایک Extended Family کے جنگل کی طرح تھا جو روایت کے سانپوں سے بھرا پڑا ہوا تھا۔ پورے گاؤں کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ آدھا گاؤں مچھلیاں پکڑتا تھا اور آدھا گاؤں ان دو فیکٹریوں میں کام کرتا تھا جن میں ان مچھلیوں کی صفائی ہوتی تھی۔ میری بیوی عورتوں کی فیکٹری میں اور میں مردوں کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس گاؤں کے ہر شخص کو سارے گاؤں کے راز پتہ تھے۔ سب جانتے تھے کہ کس کا باپ شرابی ہے اور کس کی ماں شتر بے مہار۔ کس کا بیٹا رات کو بستر میں پیشاب کرتا ہے اور کس کا بچہ پاگل خانے میں داخل ہوا تھا۔ ان حالات میں انسان چاہے بھی تو اپنی زندگی پر پردہ نہ ڈال سکتا تھا۔ ایسے گاؤں میں اخبار کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ اہم خبریں سرگوشیوں کی صورت میں خود ہی گاؤں بھر میں پھیل جاتی تھیں۔

میں ایسے ماحول سے گھبراتا تھا بلکہ بعض دفعہ تو مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں کنویں کا مینڈک تھا اور شاید وہی میرا مقدر تھا۔

اسی لیے میں نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میری بیوی اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی تو میں تہ خانے میں چلا جاتا اور اپنی تنہائی سے بغل گیر ہو جاتا۔ میرا ان تنہائی کے لمحوں سے عجیب و غریب رشتہ تھا۔

میں ان سے محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی وہ
میرے قاتل بھی تھے میرے مسیحا بھی......

جب میری بیوی چلی جاتی تو میں دروازے کھڑکیاں بند کر کے -Base ment میں چلا جاتا اور عورتوں کی طرح اسکرٹ، بلاؤز، Penty Hose، ہائی ہیل کے جوتے اور سرخی پوڈر لگا کر آئینے میں دیکھتا اور چند لمحوں کو سکون محسوس کرتا کیونکہ سکون کے لمحے ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں اور زندگی کی بے ثباتی کا ثبوت۔ میں نے وہ کپڑے، وہ جوتے، وہ میک اپ کا سامان Closet میں چھپا کر رکھے تھے۔ اپنے ذاتی کاغذات کے ساتھ۔ میری بیوی کو ان کی بالکل خبر نہ

تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے گھر کے تہ خانے میں، اس کی۔ زندگی کا سب سے بڑا راز چھپا ہے۔ ایسا راز جسے نہ وہ جانتی تھی اور نہ ہی شاید جاننا چاہتی تھی۔ میں پہلی دفعہ سائیکالوجسٹ سے ملنے آیا تو بہت مایوس ہوا۔ اس کا رویہ اس موٹر میکینک کی طرح تھا، جو گاڑی کو ہتھوڑے مار مار کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کس حصے کو مرمت کی ضرورت ہے۔ اس نے مجھ سے سینکڑوں بیوقوفی کے سوال پوچھے اور بیسیوں فارم پر کرنے کو دیے۔ میں انہیں کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ میرے خون اور پیشاب کی بھی آزمائش ہوئی۔ ایکسرے بھی لئے گئے اور پھر مجھے کچھ بتائے بغیر گھر بھیج دیا گیا۔ مجھے اپنا بوڑھا باپ یاد آیا جس کے کینسر سے مرنے سے پہلے بیسیوں ٹیسٹ ہوئے تھے اور وہ پھر بھی ایڑیاں رگڑ کر مر گیا تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے مجھے روح کا کینسر ہو اور ابھی طب نے اتنی ترقی نہ کی ہو کہ اس کی تشخیص یا علاج کر سکے۔

بہر حال ایک مہینے کے بعد کانفرنس بلائی گئی جس میں آپ بھی شامل تھیں، دو سائیکالوجسٹ بھی اور آپ کا پروفیسر بھی۔ وہ پروفیسر شاید ناکام سرجن تھا کیونکہ اس کی گفتگو میں ڈکٹیٹرانہ جاہ و جلال تھا۔ وہ تھا تو کافی صاحب علم اور تجربہ کار لیکن اس کی باتوں میں نرم گفتاری کی خوشبو نہ تھی یہ شکر ہوا کہ اس پروفیسر سے بار بار نہ ملنا پڑا۔ اس پروفیسر نے صاف صاف الفاظ میں مجھے اپنی تشخیص اور علاج بتلائے۔ کہنے لگا تمہیں ایسی بیماری ہے جس کا نام تو Transexual-ism ہے لیکن بد قسمتی سے اس کا Sex سے کوئی تعلق نہیں۔ مسئلہ دراصل Gen-der کا ہے لیکن لوگ ابھی تک Sex اور Gender کا فرق نہیں سمجھ پائے۔ اس بیماری کا مطلب یہ ہے کہ کئی لوگوں کا جسم ایک جنس کا ہوتا ہے لیکن وہ اندر سے دوسری جنس کا محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے ساری عمر عجیب عذاب میں زندہ رہتے ہیں۔ مرد عورت محسوس کرتے ہیں اور عورتیں مرد اور عمر بھر Sex Change Operation کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

اس نے جب Sex Change کے آپریشن کا نام لیا تو میری آنکھوں میں خوشی اور امید کے سورج طلوع ہونے لگے۔ وہ لمحہ شاید میری زندگی کا حسین ترین لمحہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پروفیسر کہے گا کہ اب ہم تمہارا آپریشن کروادیں گے اور تم بقیہ زندگی ایک عورت بن کر گزار سکو گے لیکن ان سورجوں کو گرہن لگتے زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ کہنے لگا کہ اگر تم آپریشن کروانا چاہتے ہو تو ہم اس کا انتظام تو نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا ادارہ ریسرچ کا ہے، علاج کا نہیں۔ لیکن ہم اپنے سینکڑوں مریضوں میں سے چند ایک کی سفارش کرتے ہیں اور وہ سفارش صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو عورت بن کر دو سال ملازمت کر چکے ہوں اور عورتوں کا لباس پہن کر معاشرے میں زندگی بھی گزار چکے ہوں۔

''لیکن ایک مرد کو عورت کی ملازمت کون دے گا۔ جب تک اس کا آپریشن نہ ہو جائے''؟

میں نے سوال کیا۔

''خیر میں تفاصیل نہیں جانتا'' اس کے لہجے میں عجب کھردرا پن تھا۔

ایسے موقعوں پر جہاں انسان کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہو رہا ہو انسان لہجے کے اتار چڑھاؤ کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔

اس لمحے آپ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ آپ نے حالات بدلتے اور مجھے بیسیوں سوال کرنے کے لئے پر تولتے دیکھا تو فرمایا ''میں تفاصیل تمہیں خود سمجھادوں گی''

چند لمحوں کے بعد وہ پروفیسر تو چلا گیا اور میں خلاؤں میں گھورتا رہ گیا۔ اس پروفیسر نے امید کی ایک کرن تو دکھائی تھی لیکن وہ کرن کسی اور کرہ ارض سے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک ایسا ٹوٹا ہوا ستارہ تھا جو اندھیروں سے ابھر کر اندھیروں میں ہی ڈوب گیا تھا۔

پھر آپ مجھے اپنے دفتر میں لے گئیں اور بڑی شفقت اور ہمدردی سے

سمجھایا کہ وہ پروفیسر بہت سخت گیر اور اکھڑ مزاج کا ہے۔ بہت سے لوگ اس سے نالاں ہیں لیکن چونکہ وہ بہت قابل ہے اس لئے اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا اور میں سوچنے لگا کہ قابل لوگ اتنے بدمزاج اور خوش مزاج لوگ اتنے سادہ لوح کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے اس دن آپ سے ذکر کیا کہ میرا پہلا مسئلہ میری بیوی ہے اسے حقیقت حال بتانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تہ خانے میں چوروں کی طرح چند لمحے عورتوں کے کپڑے پہن کر سکون حاصل کرتا ہوں تو ہفتوں احساس جرم میں مبتلا رہتا ہوں۔

آپ نے مشورہ دیا کہ میں اگلی دفعہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آؤں تاکہ آپ اس سے تفصیلی گفتگو کر سکیں۔

میں سر کھجاتا ہوا گھر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے زندگی کے چند اہم فیصلے کرنے ہیں۔ یا تو میں احساس تنہائی اور احساس گناہ کی آگ میں سلگتا رہوں اور یا اپنی بیوی کے آگے دل کھول کر رکھ دوں۔

"لیکن اس کا حشر کیا ہوگا" دل کے ایک کونے سے سوال ابھرتا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا" دوسرے کونے سے جواب آتا۔ میں اسی داخلی مکالمے سے سر پٹختا گھر پہنچا۔ میری بیوی حسب دستور منتظر تھی۔

مجھ میں اس دن بھی سب کچھ بتانے کا حوصلہ نہ تھا۔

"آخر آج کیا ہوا؟ اس نے پوچھا

"ماہر نفسیات نے اگلی دفعہ تمہیں بلایا ہے"

"آخر کیا کہنا چاہتا ہے"

"میں نہیں جانتا" میں نے بہت کوشش کی، لیکن میری زبان پر جیسے چھالے پڑ گئے تھے۔

اپنی بیوی کے ساتھ گزارے ہوئے دس سال میری زندگی کا اہم باب تھے۔ اس نے میری بہت سے خوبصورت لوگوں سے ملاقات کروائی تھی اور پھر

مجھے اس کا بھانجا یاد آگیا جو اس وقت پانچ سال کا تھا اور بہت کھلنڈرا تھا۔ وہ شاید میری زندگی کی واحد مسکراہٹ تھا، وہ مجھ سے ملتا تو میری سوگوار روح میں گدگدی ہوتی اور میرا صدیوں سے مرجھایا چہرہ انار کے دانے کی طرح کھلکھلا اٹھتا۔ وہ شہزادہ اتنا چالاک تھا کہ اسکول سے چھوٹی چھوٹی پہیلیاں سن کر آتا اور پھر مجھ سے ان کا جواب پوچھتا۔ ایک دن کہنے لگا:

"انکل

"What did the wall say to the ceiling?

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو کہنے لگا:

"See you in the corner"

اور ہم دونوں ہنس دیے۔ اسے آنکھ مچولی کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ جب بھی میرے ساتھ پارک میں کھیلنے جاتا تو کسی جھاڑ یا کسی درخت کے پیچھے چھپ جاتا اور میں اسے تلاش نہ کر پاتا تو بہت خوش ہوتا۔

میری بیوی مجھے اس کے ساتھ کھیلتے دیکھتی تو اس کے دل میں ماں بننے کی خواہش کروٹیں لینے لگتی۔ وہ ایک دفعہ غلطی سے حاملہ ہو بھی گئی تھی لیکن پھر اس کا خود ہی اسقاط بھی ہو گیا تھا۔ میں اس دن جتنا خوش تھا میری بیوی اتنی ہی افسردہ تھی۔ میں کسی بچے یا بچی کو اس دنیا میں لانے کا خواہشمند نہ تھا۔ میری صلیب پہلے ہی سے بہت بھاری تھی۔ میری بیوی، ایسی باتیں سنتی تو سمجھتی کہ میں اسے نااہل ماں سمجھتا ہوں۔ میں نے جتنی تردید کرنے کی کوشش کی، اس کے دل میں وہ خیال اتنا ہی جڑ پکڑتا گیا۔ آخر میں نے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میری بیوی کے لئے یہ حقیقت جاننا کہ میں ایک عورت ہوں، آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے کم نہ ہو گا لیکن پھر میں سوچتا کہ نئی بستی تعمیر کرنے کے لئے پرانی بستی تباہ کرنی ہی پڑتی ہے۔ اور محل بنانے کے لئے جھونپڑے کو گرانا ہی پڑتا ہے لیکن میں بھی کتنا سادہ تھا۔ نجانے کتنی پرانی بستیاں

تباہ ہو جاتی ہیں لیکن نئی بستیاں نہیں بن پاتیں۔ جھونپڑے گر جاتے ہیں، لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں لیکن محل نہیں بن پاتے۔ میری بیوی کا آپ سے ملنا میری زندگی کا ایک موڑ تھا جس کے بعد میری زندگی کی گاڑی جو کچے راستے پر ہچکولے کھاتی جا رہی تھی بالکل پٹڑی سے ہی اتر گئی۔ اس میں قصور نہ آپ کا تھا، نہ اس کا، نہ میرا۔ ایسے حالات میں الزام حالات پر دھرنا ہی دانشمندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دانشمند یہ بھی جانتے ہیں کہ حالات ہمارے ہی بوئے ہوئے بیج ہیں جن کی فصلیں کاٹتے ہم بہت گھبراتے ہیں۔

میری بیوی آئی اور آپ نے اسے میرے سامنے بتایا کہ وہ مرد جس سے اس نے مرد سمجھ کر شادی کی تھی در پردہ عورت ہے اور ایسے شخص کو ہم نفسیات کی زبان میں Transexual کہتے ہیں۔

پہلے میری بیوی نے آپ کو دیکھا، پھر مجھے، پھر آپ کو، پھر مجھے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ لیکن جب آپ نے بتایا کہ اس کے تہ خانے کی ایک الماری اس کی گواہ ہے۔ آپ نے اس کا بھی ذکر کیا کہ میں برسوں سے تہ خانے میں اتر کر اور اسکرٹ، بلاؤز، اونچی ہیل کی جوتی اور میک اپ پہن کر سکون کے چند لمحے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آتش فشاں پھٹ پڑا۔ جذبات کا لاوا چاروں طرف بہنے لگا۔ ان جذبات میں غصہ اور نفرت زیادہ تھے ہمدردی کم۔ وہ مجھ سے کہنے لگی ”تم ذلیل ہو، کمینے ہو، بے غیرت ہو، تم نے مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا۔ تم میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو۔ تم برسوں سے جھوٹ بولتے آئے ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ اندھیرے میں رکھا ہے۔“

وہ اتنے غصے میں تھی کہ پنجرے میں بند شیرنی کی طرح کمرے میں تیز تیز چلنے لگی۔

اگر اجازت ہو تو میں بھی ذرا چہل قدمی کر لوں۔ چلتے ہوئے باتوں اور

خیالات میں ایک خاص قسم کا تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔

انٹرویو کے آخر میں میری بیوی نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ مجھے گھر نہیں لے جائے گی۔ میرے پاس کوئی اور جگہ جانے کی نہ تھی چنانچہ آپ نے مجھے چند دنوں کے لئے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ آپ نے جب میری بیوی سے دوبارہ آنے کی درخواست کی تھی تو وہ غصے میں دروازہ دھڑام سے بند کرتے ہوئے چلی گئی تھی۔

وہ بہت بھاری پتھر تھا جسے آپ نے اٹھانے کی ہمت کی تھی میں تو اسے چھو کر ہی چھوڑ دیتا تھا۔

بظاہر یوں لگتا تھا کہ حالات بدتر ہو گئے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ دیر وہ حالات بہتر ہو جائیں گے لیکن بعض دفعہ حالات اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے کہ لگتے ہیں لیکن ہم انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے امید ہماری آنکھوں کو خیرہ کئے رہتی ہے۔

میرا چند دنوں کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا بھی میری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔

میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ سب باتیں یاد ہیں یا نہیں شاید آپ کے حافظے میں محفوظ نہ رہی ہوں۔ ویسے ان واقعات کو بھی تو برسوں بیت گئے ہیں لیکن وہ سب باتیں میرے دل پر آج تک نقش ہیں اور میں آخری بار آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد مجھ پر جو بیتی اور جن جن مریضوں اور مریضاؤں سے ملاقات ہوئی اس کی شاید آپ کو خبر نہ ہو آپ تو دن میں دو گھنٹوں کے لئے آتی تھیں لیکن میں وہاں چوبیس گھنٹے رہتا تھا۔

میری جب آپ سے اگلی ملاقات ہوئی تو آپ نے دو مشورے دیے۔ پہلا مشورہ یہ تھا کہ میں عورتوں کی Pills کھانی شروع کر دوں کیونکہ ان میں نسوانی Hormones ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے سمجھایا کہ ان سے میری جلد اور

میرے بال بدلنے، میرے پستان بڑھنے اور Testicles گھٹنے شروع ہو جائیں گے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی دن سے پلز کھانی شروع کر دیں۔

آپ کا دوسرا مشورہ گروپ تھیرپی میں شمولیت کا تھا۔ میں اس کے لئے ہچکچایا تھا۔ مجھے سمجھ نہ آیا تھا کہ چند مریض مل کر ایک دوسرے کی کیسے مدد کر سکتے ہیں لیکن آپ نے جب چند مہینے آزمانے کو کہا تو میں راضی ہو گیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔

اس گروپ میں میری ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو میرے احاطہ عقل سے بہت باہر رہتے تھے۔

چند دنوں کے بعد جب میری بیوی دوبارہ آئی تو غصے نے سنجیدگی کا روپ دھار لیا تھا اور وہ کاغذ پر بہت سے سوال لکھ کر لائی تھی۔ اس دن میں آپ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ مجھے اس دن اندازہ ہوا تھا کہ آپ ایک اچھی تھیرپسٹ ہی نہیں، ایک اچھی معلمہ بھی ہیں۔ آپ نے بلیک بورڈ پر میری بیوی کو جو باتیں سمجھائی تھیں وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔

آپ نے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انسان کی جنسی زندگی بہت پیچیدہ ہوتی ہے اور بہت سے مراحل سے گزرتی ہے اگر کوئی شخص چند بنیادی باتوں سے واقف نہ ہو تو وہ جنسی زندگی کی نشو و نما کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ پھر آپ نے اس ارتقا کے مختلف مدارج کی تشریح کی تھی۔

آپ نے سمجھایا تھا کہ کسی بچے کا لڑکی یا لڑکا ہونا اس کی Genes پر منحصر ہوتا ہے جو اس کے Chromosomes کا حصہ ہوتی ہیں عورتوں میں دو ایکس (XX) اور مردوں میں ایک X اور ایک Y کروموسومز ہوتے ہیں۔ اس پہلے مرحلے پر ہم اسے Genetic Sex کہتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ بچوں کے جنسی اعضاء کی نشو و نما کا ہوتا ہے جسے ہم -Ana

tomic Sex کہتے ہیں۔ لڑکیوں میں Ovaries اور Uterus اور لڑکوں میں Penis اور Testicles تشکیل پاتے ہیں۔

اس دن مجھے بھی پہلی دفعہ پتہ چلا تھا کہ سب Fetus بنیادی طور پر مادہ ہوتے ہیں لیکن وہ Fetus جو Y کروموسوم سے متاثر ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ نر کا روپ دھار لیتے ہیں اور لڑکے بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی میں نقص رہ جائے تو پھر Hermaphrodite جنم لیتے ہیں، جن میں نر اور مادہ آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ شاید انھیں لوگوں کو ہم ہیجڑا کہہ کر بلاتے ہیں۔

تیسرے مرحلے سے بچہ تین اور پانچ سال کی عمر کے دوران گزرتا ہے۔ اس وقت بچے کو یہ شعور ہونے لگتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی اور اس کی عادات واطوار، اس کے شوق، پسند وناپسند میں اس کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ یہ وہ موڑ ہوتا ہے جہاں سے مردانگی اور نسوانیت کا احساس شروع ہو جاتا ہے یہ شناخت کا مرحلہ Gender Identity کہلاتا ہے اور یہی شناخت کا مرحلہ تھا جو میرے مسائل کی بنیاد تھی۔ اگر کسی انسان کا جسم لڑکوں کا ہو اور وہ لڑکی محسوس کرے یا جسم لڑکی کا ہو اور وہ لڑکا محسوس کرے تو ہم اسے Transexual کہتے ہیں۔

چوتھا مرحلہ جنسی کشش کا ہوتا ہے جو بلوغت کی عمر تک پرورش پاتا رہتا ہے اور Sexual Orientation کہلاتا ہے۔ اکثر نوجوان مخالف جنس کو پرکشش پاتے ہیں اور Heterosexual کہلاتے ہیں لیکن بعض نوجوان اپنی ہی جنس کے افراد کو ترجیح دیتے ہیں اور Homosexual کہلاتے ہیں۔ یہ مسئلہ Transexu-al سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک Transexual کا اپنے آپ کو عورت سمجھ کر دوسرے مرد کو پسند کرنا ایک Homosexual کے دوسرے مرد کو پسند کرنے سے بالکل مختلف جذبہ ہوتا ہے۔

پانچواں مرحلہ Sexual Performance کا ہوتا ہے اگر مرد جنسی عمل

میں ناکام رہے تو ہم اسے Impotent کہتے ہیں اور اگر عورت ناکام رہے تو وہ Frigid کہلاتی ہے۔

میری بیوی بیسیوں سوال پوچھتی رہی، آپ تحمل سے جواب دیتی رہیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔

آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک گروہ Transvestites کا ہوتا ہے جو جنس بدلنا تو نہیں چاہتا لیکن کبھی کبھار چند گھنٹوں کے لئے جنس مخالف کے کپڑے پہننا چاہتا ہے تاکہ جنسی لذت حاصل کر سکے۔ یہ گروہ بھی Transexual سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ Transexual جنس مخالف کے کپڑے پہن کر جنسی حظ محسوس نہیں کرتے اور وہ چند گھنٹوں کی بجائے عمر بھر کے لئے وہ کپڑے پہننا چاہتے ہیں۔

مجھے اس دن پتہ چلا کہ میری بیوی مدتوں سے یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس لئے نہیں سوتا کہ وہ موٹی ہے اور Oral Sex پسند نہیں کرتی۔ میں نے سوچا انسان اپنے ضمیر اور دل پر کتنے بوجھ اٹھائے پھرتا رہتا ہے۔ آپ کی گفتگو سے اس کے روح کی بہت سے کانٹے نکل گئے اور غلط فہمیوں کی دھند چھٹ گئی۔

میری بیوی نے آپ کا شکریہ تو ادا کیا لیکن یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ اس دن کے بعد وہ میرے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہے گی۔ میں بھی اس لمحے کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک تکلیف دہ لمحہ تھا اور انتظار کسی لمحے کی تکلیف کو کم تو نہیں کرتا۔

انٹرویو کے بعد میری بیوی رخصت ہو گئی۔ وہ نہ تو گلے ملی اور نہ ہی اس نے الوداعی بوسہ دیا۔ بس نظریں جھکائے کمرے سے نکل گئی اور میں چند دن اور ہسپتال کی قید میں پڑا رہا۔

اس شام میں ہسپتال میں ایک لمبی سیر کے لئے نکلا تاکہ اپنا غم غلط کر سکوں میرا ذہن آوارہ بادلوں کی طرح ادھر ادھر پھرتا رہا۔ مجھے آپ کی یہ

بات بہت دلچسپ لگی کہ انسانی Fetus بنیادی طور پر عورت کا ہوتا ہے جب وہ Y کروموسوم سے متاثر ہوتا ہے تو مرد کا روپ دھارنا شروع کردیتا ہے اور اگر متاثر نہ ہو تو عورت کا ہی رہتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہی حال انسانی تاریخ اور معاشرے کا تھا۔ ایک وہ دور تھا جب ساری دنیا کا نظام Matriarchial تھا۔ انسان دیویوں کی پوجا کرتے تھے، ماں کا تصور سب سے مقدم تھا۔ لوگ اپنی زبان کو مادری زبان اور اپنے علاقے کو مادرِ وطن کہہ کر پکارتے تھے۔ بچے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ نظام بدلتا گیا اور ساری دنیا Patriarchial بنتی گئی۔ مردوں نے انسانی روایات اور اقدار کو بدلنا شروع کردیا۔ بچے ماں کی بجائے باپ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ Goddesses کے مہرباں ماؤں کے تصور کو بدل کر God کے جابر باپ کے تصور کو عام کیا گیا۔ ایسا خدا جس نے جنم کے تصور کو جنم دیا۔ یہ علیحدہ بات کہ یہودی آج بھی اسی بچے کو یہودی سمجھتے ہیں جس کی ماں یہودی ہو اور مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قیامت کے دن بچے ماں کے نام سے پکارے جائیں گے لیکن اس دنیا میں عورتیں دوسرے درجے کی شہری بن چکی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ میری روح عورت کی تھی جو Y کروموسوم سے متاثر نہ ہوئی تھی۔ جسم مرد کا بن گیا تھا اور روح عورت کی ہی رہی تھی۔

ہسپتال میں میرے سامنے دو ایسے مسئلے تھے جن کا فوراً حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے دونوں کا حل تلاش کرنے میں مدد کی۔ جہاں تک ملازمت کا تعلق تھا۔ آپ نے سرٹیفکیٹ لکھ دیا کہ میں بیمار ہوں آپ نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وجہ کیا لکھوں میں نے سوچا تھا کہ اگر Transexual لکھا تو پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی اور میرا جینا حرام ہو جائے گا چنانچہ آپ نے De-pression لکھ دیا وہ تشخیص بے ضرر تھی۔ میرے گاؤں کا ڈاکٹر بھی ایک دفعہ لکھ

چکا تھا۔

دوسرا مسئلہ رہائش کا تھا۔ میری بیوی اتنے غصے میں تھی اور میں اتنا دل برداشتہ کہ ہم دونوں ایک چھت تلے جمع نہ ہو سکتے تھے اور کسی اور خاندان کے ساتھ رہنا میرے لئے مناسب نہ تھا۔ آخر آپ کے سوشل ورکر نے مشورہ دیا کہ میں اپنا گاؤں چھوڑ کر ساتھ والے بڑے گاؤں میں منتقل ہو جاؤں۔ اس میں ایک دس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس میں ایک Basement Appartment خالی تھی۔ وہ شاید اس علاقے کی سب سے اونچی بلڈنگ تھی کیونکہ ایک دفعہ اخبار میں کسی نے سوال اٹھایا تھا کہ اس پورے علاقے میں کوئی اونچی عمارتوں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کیوں نہیں کرتا تو ایک ڈاکٹر نے جواب دیا تھا کہ اس علاقے میں اونچی عمارات ہیں ہی نہیں اسی لئے لوگ پانی میں ڈوب مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ویسے تو اس واقعے کو کئی سال بیت گئے ہیں لیکن میری نگاہوں میں وہ سب مناظر آج بھی تر و تازہ ہیں۔

ہسپتال میں اور گروپ تھیراپی میں، میری ملاقات ایسے مردوں اور عورتوں سے ہوئی جو مجھ سے بھی بھاری صلیب اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔

میں نے بیسمنٹ اپارٹمنٹ کرایے پر لے لیا اور معمولی سا فرنیچر خرید کر منتقل ہو گیا۔ وہ میری زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ موڑ مجھے شہر ناامیدی کی تنگ اور تاریک گلیوں سے نکال کر امید کی روشن شاہراہوں پر لے جائے گا لیکن ہوا یوں کہ میری تنہائی کا کرب بڑھنے لگا۔ مجھے اپنی بیوی بہت یاد آئی۔ وہ میری بیوی ہی نہ تھی۔ میری دوست بھی تھی اور اس کی جدائی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ آخر میں نے گھٹنے ٹیک دئے اور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میری بیوی کا بھی دل پسیج گیا۔ اور اس کی تلخی بھی آنسو

بن کر ٹپکنے لگی۔ ہم دونوں مل کر کافی دیر تک روتے رہے جیسے اپنے رشتے کی لاش پر ماتم کر رہے ہوں۔

دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو ہم نے بھولی بسری یادوں کے سائے میں شام گزاری۔ میں نے اسے بچپن اور نوجوانی کے بہت سے واقعات سنائے ایسے واقعات جو میں اسے پہلے سناتے ہوئے گھبراتا تھا۔

رشتے ٹوٹ جائیں تو ایک نئی آزادی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اس شام ہماری قربتوں اور جدائیوں کے رنگ ملتے اور نکھرتے رہے۔ اگرچہ اس شام کی تفاصیل دھند میں لپٹی ہوئی ہیں لیکن ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ میری بیوی کو اس شام اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کے اسقاط میں، جسے وہ ہمیشہ ایک بھیانک خواب سمجھا کرتی تھی ایک سکون کا پہلو پوشیدہ ہے۔ ہم دونوں کو اندازہ ہوا تھا کہ انسان در حقیقت کتنا سادہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کے راہوں سے بھی واقف نہیں۔ وہی چیزیں جنہیں وہ عذاب جان سمجھتا رہتا ہے۔ انہی کی کوکھ سے خوشخبری کے گلاب بھی جنم لیتے ہیں۔

میں واپس لوٹا تو سبک محسوس کر رہا تھا لیکن تنہائی کی فصیل بلند سے بلند تر ہو گئی تھی۔ ایک قید خانے کا دروازہ دوسرے قید خانے میں کھل گیا تھا۔

میں اگلے چند مہینے گروپ Attend کرتا رہا۔ آپ کے گروپ کی دنیا ہی علیحدہ تھی۔ اس کے بارے میں میرے سب خدشات بے بنیاد نکلے۔ میں نے اس گروپ میں انسانی معجزے رونما ہوتے دیکھے۔ نہ تو لوگ اپنے زخموں سے پردہ اٹھاتے، شرماتے تھے اور نہ ہی دوسرے لوگ ان پر مرہم رکھتے ہچکچاتے تھے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ دوسروں کے غموں کو دور کرنے کی کوشش میں انسان اپنے غم بھول جاتا ہے۔ شاید لوگ اسی لئے ماہر نفسیات بنتے ہیں شاید ان کے اپنے دکھ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ عمر بھر دوسروں کے دکھ میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ آپ کہتی ہوں گی کہ میں نے پھر طنزیہ لہجہ اپنا لیا ہے۔ طنز کا خندہ زہر

خند ہوتا ہے اسی لئے طنز وہ کام کر جاتا ہے جو مزاح کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔

مجھے گروپ میں چند مہینے کی شمولیت سے اس گاؤں کی یاد آگئی تھی جس میں آگ لگ گئی تھی۔ سب لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے صرف ایک لنگڑا اور ایک اندھا شخص باقی رہ گیا تھا۔ جب سب جا چکے تو لنگڑے نے اندھے سے کہا ''آخر تم مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا لو تو ہم دونوں گاؤں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں تمہاری آنکھیں بن جاؤں گا۔ تم میرے پاؤں'' وہ مریض بھی اپنی جلتی زندگیوں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ایک مریض کے مسائل دوسرے کی آنکھیں بن گئے تھے۔

میں پہلے کئی ہفتے تو دوسروں کے مسائل سنتا رہا۔ انہوں نے جب بھی مجھے دعوت دی میں نے اس بچے کی طرح محسوس کیا، جو دریا کے اتھلے حصے میں تو کھڑا ہو سکتا ہو لیکن گہرے پانی میں کودنے سے گھبراتا ہو۔ اگرچہ آپ سب نے میری حوصلہ افزائی کی اور یقین دلایا کہ آپ کے پاس Life Jacket ہے اگر میں ڈوبنے لگوں گا تو آپ مجھے بچا لیں گے لیکن مجھے آپ لوگوں پر اعتماد نہ تھا۔ عین ممکن ہے مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو اِسی لئے میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ رہا تھا لیکن جوں جوں میں دوسروں کے اندر کی آگ محسوس کرنے لگا میرے اندر کی برف بھی پگھلنے لگی۔ سب سے پہلے میں نے اس کالی عورت کی داستان سنی، جو ایک کالے مرد کے ساتھ رہتی تھی اور تین بچوں کی ماں تھی۔ پندرہ سال کی ازدواجی زندگی میں اس نے اپنی انا پر نجانے کتنے زخم اور چرکے سہے تھے۔ اس کا خاوند اتنا جابر تھا کہ اگر وہ رات دو بجے بھی آتا اور اس کی بیوی کھانا گرم کرنے میں دیر کرتی تو سیخ پا ہو جاتا۔ وہ اتنا شور مچاتا کہ کئی دفعہ بچے جاگ جاتے۔ ایک دو دفعہ تو اس نے میز سے پلیٹیں اٹھا کر دیوار پر دے ماری تھیں۔

وہ عورت ہمیشہ سہمی سہمی رہتی۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس کا شوہر کس

بات پر خفا ہو جائے گا۔ بچے بھی باپ سے خائف رہتے۔ سب لوگ اسے Bull in a China Shop کہہ کر پکارتے اور وہ اس پر فخر کرتا۔

پندرہ سال کے بعد اسے ایک گوری عورت مل گئی جو اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ اس کالی عورت پر اس شام قیامت ٹوٹی جس شام اسے احساس ہوا کہ وہ نہ صرف اس گوری عورت کو پسند کرتی ہے بلکہ اسے جنسی طور پر پرکشش بھی پاتی ہے۔ وہ گوری عورت بھی شادی شدہ تھی اور اپنے دو بچوں اور خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو عورتوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہو چکی تھی لیکن اس کالی عورت کے تعلقات میں جو شدت تھی وہ اس نے پہلے محسوس نہ کی تھی۔ وہ آگ جو برسوں راکھ تلے سلگتی رہی تھی آخر بھڑک اٹھی تھی۔ کالی عورت کے لئے یہ جاننا کہ وہ Lesbian ہے ایک نئے خدا پر ایمان لانے کی طرح تھا۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں اپنے جذبات کو دبانے یا چھپانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ہمارے جذبات اپنا علیحدہ ذہن رکھتے ہیں اور خود مختار ہوتے ہیں۔ ہماری عقل چاہے جتنے دلائل پیش کرے وہ نہیں مانتے۔ عقل کو جلد یا بدیر جذبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑتے ہیں۔ آخر ان دو چاہنے والیوں نے اپنے اپنے شوہروں کو الوداع کہا اور پانچ بچوں کو لے کر اکٹھے رہنے لگیں۔

اس شام میرے دشتِ حیرت میں چند درخت ابھر آئے جن کے سائے میں میں کافی دیر تک سکون سے لیٹا رہا۔ مجھے یقین نہ آتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ زندہ ہیں جن کے مسائل مجھ سے بھی زیادہ گنجلک ہیں۔ میں ان دونوں عورتوں کی بہادری پر رشک کرتا رہا بلکہ ان سے ہمت مستعار لیتا رہا۔ شاید یہ اسی مستعار ہمت کا فیضان تھا کہ میں نے اگلے گروپ میں اپنی روح کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا اور اپنے ماضی سے پردے اٹھانے شروع کر دیے۔

وہی ماضی .... جو حال کے چاند پر بادلوں کی طرح چھایا رہتا ہے۔

وہی ماضی .... جو ہمارے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتا ہے۔

وہی ماضی ...... جس کے ناخنوں سے ہم حال اور مستقبل کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس جدوجہد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات تو گتھیاں نہیں سلجھتیں انگلیاں ضرور لہولہان ہو جاتی ہیں۔

گروپ کے دوستوں کو میں نے اپنے بچپن کی باتیں سنائیں۔ ان کھلونوں کی باتیں، جو مٹی کے تھے۔ شاید اسی لئے زندگی کی تیز ہواؤں کو برداشت نہ کر سکے اور ٹوٹ گئے میں سوچا کرتا تھا کہ سب بچوں کے کھلونے مٹی کے ہوتے ہونگے لیکن اب تو بچوں کے کھلونے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انسان بڑھاپے میں بھی ان کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔

میں نے گروپ کے ساتھیوں کے سامنے اپنے خاندان کو بھی ننگا کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے جس گھرانے میں پرورش پائی تھی اس پر میرے والد کا آسیب چھایا رہتا تھا۔ میرے والد، جو ایک پولیس افسر تھے۔ ان کی نگاہ میں بچوں کو بس دیکھنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا بات کرنے کیلئے نہیں۔ اگر کوئی بچہ رو رہا ہوتا تو وہ ایسے چیختے جیسے جنگل میں شیر چنگھاڑتا ہے اور ہم سب معصوم خرگوشوں اور پرندوں کی طرح سہم جاتے تھے۔

ان کے مقابلے میں میری والدہ بہت مہربان تھیں۔ جب والد چیختے چنگھاڑتے تو وہ اپنا دامن وا کر دیتیں اور ہم سب بچے ان کی آغوش سر چھپا لیتے۔ وہ ہمیں سہارا تو دیتیں لیکن والد کے خلاف کچھ نہ کہتیں۔ وہ سارے ظلم ساری عمر مسکراتے ہوئے برداشت کرتی رہیں۔ بچوں میں سب سے بڑا میرا بھائی تھا، پھر میری بہن۔ میں سب سے چھوٹا تھا، میرے بھائی اور باپ میں ہمیشہ ٹھنی رہتی۔ میرا بھائی بغاوت کرتا تو والد اسے کچلنے کی کوشش کرتے ایک دو دفعہ تو میرے والد نے میرے بھائی کو غصے میں ایسا دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے جا کر ٹکرایا اور اس سے خون بہنے لگا۔

میں ایسے موقعوں پر سہم جایا کرتا تھا اور اپنے والد سے خوفزدہ رہتا تھا۔

میرے گھر میں میری بہن میری سہیلی تھی۔ میں اس کے کپڑے بڑے شوق سے پہنتا تھا اور ایک دن اس کی طرح بننا چاہتا تھا۔

میں شاید پانچ چھ سال کا ہوں گا کہ مجھے احساس ہوا تھا کہ میرا جسم تو لڑکوں کا تھا لیکن میں اندر سے لڑکی تھا۔ میں اپنی، تو تو، دیکھ کر بہت حیران ہوتا۔ میں بچپن میں اپنے Penis کو، تو تو، کہا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے، ایک دن جب میں نے اپنی والدہ سے کہا تھا ''اماں! اگر میری، تو تو نہ ہوتی، تو میں لڑکی لگتا'' تو وہ بہت برہم ہوئی تھیں اور مجھے ایسی باتیں کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اماں سے کبھی ایسی بات نہ کی تھی لیکن اس سے میرے جذبات نہ بدلے تھے۔ میں دل میں محسوس کرتا تھا کہ میں اپنی بہن کی طرح ہوں۔ اپنے بھائی کی طرح نہیں۔ مجھے لڑکوں اور لڑکیوں سے کھیلنے کی بجائے گڑیوں سے کھیلنے کا زیادہ شوق تھا۔

میں دن رات بے کل رہتا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آتا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا ہو رہا ہے۔ آخر ایک دن میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس میں مجھے دو تصویریں نظر آئیں ایک عورت کی تھی ایک مرد کی اور نیچے لکھا تھا کہ یہ عورت مرد تھی لیکن اب آپریشن کروا کر عورت بن گئی ہے۔

میں نے وہ تصویریں کاٹ لیں اور اپنے کمرے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھ لیں۔ میرے دل میں گدگدی ہوئی کہ ایک دن میں بھی عورت کی طرح زندگی گزار سکوں گا۔ میں شاید اس وقت دس سال کا تھا۔ وہ شام میری زندگی کی اہم شام تھی۔ میں اس رات بڑے سکون سے سویا تھا۔

لیکن میں کتنا نادان تھا۔ آخر ایک بچہ تھا۔ بچوں کے ذہنوں میں کتنے خواب ہوتے ہیں جو ہمیشہ خواب ہی رہتے ہیں۔ تعبیروں کا لبادہ نہیں اوڑھ

سکتے۔ کتنی آرزوئیں ہوتی ہیں جو دربدر بھٹکتی رہتی ہیں۔ کتنی تمنائیں ہوتی ہیں جو دیواروں سے سر ٹکراٹکرا کر خودکشی کرلیتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے اپنی شناخت بدلنی چاہی، اپنی شخصیت بدلنی چاہی، اپنی ذات بدلنی چاہی لیکن لوگوں نے میرے راستے میں کانٹے بچھادیے۔ میں اپنے آپ کو Define نہ کر سکتا تھا۔ لوگ مجھے Define کر رہے تھے۔ میں جب بھی کہتا کہ میں عورت ہوں تو وہ میرا مذاق اڑاتے مجھے پاگل سمجھتے اور سچی بات یہ ہے کہ پاگل پن کے خوف نے ہی مجھے پاگل کردیا تھا۔

اسکول اور کالج کے زمانے میں بھی خاموشی کی چادر اوڑھے پھرتا رہتا تھا۔ میرے دوست، میرے ہم جماعت لڑکیوں کی باتیں کرتے، ان کا مذاق اڑاتے تو میرے خون میں ابال آنے لگتا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں نے آہستہ آہستہ دوستوں سے علیحدگی اختیار کرلی لیکن وہ پھر بھی نہ مانے۔ جب انہوں نے مجھے کبھی بھی عورتوں میں دلچسپی کا اظہار نہ کرتے دیکھا تو سمجھنے لگے کہ میں Homosexual ہوں۔

ایک دن میں گھر جارہا تھا کہ اسکول کی گلی کی نکڑ پر چند اسکول کے بدمعاش لڑکے تھے۔ میں قریب سے گزرا تو انہوں نے فقرے کسے "یہ Gay ہے Faggot کہیں کا"، "مجھے تو Queer لگتا ہے"

میں کھڑا ہوگیا۔ میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔ سارے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا اور میں ان کی طرف لپکا۔ باقی لڑکے تو بھاگ گئے لیکن ایک میرے قابو میں آگیا۔ میں نے اس پر تھپڑوں، مکوں، اور ٹھڈوں کی بارش کردی۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا جب اس کے سر سے خون کی لکیر اس کے چہرے تک آگئی۔ میں نے اسے دور دھکا دیا اور خاموشی سے گھر کی طرف چل دیا۔

اس واقعہ کے بعد کسی نے مجھے اسکول میں نہ چھیڑا بلکہ لڑکے راستہ کترا

کر گزر جاتے۔

لیکن میں اپنے آپ سے گھبرا گیا تھا۔ میں اپنے اندر نفرتوں کے بہتے ہوئے لاوے سے ڈر گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے غصے سے توبہ کر لی تھی میں جانتا تھا کہ اگر اس قسم کا حادثہ دوبارہ پیش آیا تو یا تو میرا مد مقابل قتل ہو جائے گا یا میں جیل کی کوٹھری میں پہنچ جاؤں گا۔

قید تنہائی تو میں ویسے ہی گزار رہا تھا قید با مشقت کی کوئی خواہش نہ تھی۔

میں گروپ میں اپنا حال سناتا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ اپنی بپتا سنا چکا تو قدرے سبک محسوس کرنے لگا۔ گروپ کے لوگ میری باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اجنبیوں کے سامنے اپنی داستان حیات سنائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے لیکن انہوں نے میرے سامنے ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا بلکہ دو ممبروں نے تو گروپ کے بعد مجھے گلے سے لگا لیا۔

میں نے سوچا ہم لوگوں سے خواہ مخواہ گھبراتے رہتے ہیں۔ نجانے کتنے اجنبی اور بیگانے ایسے ہیں جو ہمارے دوست بن سکتے ہیں لیکن ہم انہیں کبھی قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔

میں اپنی کہانی سنا چکا تو گروپ کا ایک اور نوجوان آگے بڑھا۔ شاید میری باتیں سن کر اسے بھی اپنی روح کو ننگا کرنے کا حوصلہ ہوا تھا کیونکہ اس دن تک وہ اپنے جسم کو ہی جا بے جا ننگا کرتا رہا تھا اور اس سلسلے میں گرفتار بھی ہو چکا تھا۔ اسکے بارے میں مختلف مواقع پر مختلف عورتوں نے پولیس کو فون کیا تھا اور ایک دن پولیس نے اسے بغیر پتلون کے پکڑ لیا تھا۔ وہ بتانے لگا کہ وہ پارکنگ لاٹ میں جا کر کار پارک کر دیا کرتا تھا اور پھر اپنی پتلون اتار کر گاڑی میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔ کئی دفعہ عورتیں جب اپنی کاروں میں واپس لوٹتیں تو اسے ننگا دیکھتیں۔ اس

کے بعد وہ بھی گاڑی چلانے لگتا اور وہ عورتیں بھی گھبرا کر چل دیتیں۔ آخر بعض عورتوں نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا اور پولیس میں رپورٹ لکھوا دی۔

میری کبھی ایسے شخص سے ملاقات نہ ہوئی تھی اسلئے میں متجسس تھا۔ میں نے اس کے ماضی میں جھانکنا چاہا تو وہ کہنے لگا کہ جس طرح تم نے کھل کر بات کی ہے میں بھی کھل کر بات کروں گا۔ پھر وہ یادوں کی بیساکھیوں پہ چلتا ہوا اس دور میں پہنچ گیا جب وہ ایک Teenager تھا اور موسیقی کا شیدائی تھا وہ ان دنوں دوستوں کے ساتھ مل کر گانے لکھا کرتا تھا اور پھر انہیں گٹار پر بجایا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے والدین کے گھر کے بیسمنٹ میں رہا کرتا تھا۔

ایک رات وہ تین بجے تک ایک گانے پر محنت کرتا رہا لیکن بات نہ بنی وہ اپنے گانوں میں نئی روح پھونکنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہو پاتا تھا اچانک اسکے جی میں کیا آئی کہ اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کیۓ اور جب سب کپڑے اتار چکا تو گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ اس رات کے تاریک جنگل میں کھو جانا چاہتا تھا۔ چاروں طرف اتنی تاریکی تھی کہ اسے اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ مختلف گلیوں اور بازاروں میں گھومتا، بلڈنگوں کے گرد چکر لگاتا ایک گھنٹے بعد واپس آگیا۔ اس کا سراپا پسینے میں شرابور تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی سوۓ ہوۓ مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کا نوالہ نکال لیا ہو۔ شہر میں اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے والدین کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ اس رات کے بعد اس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ مہینے میں ایک دفعہ رات کی تاریکی میں اتر جاتا۔ اکثر اوقات وہ مہینے کی تاریک ترین رات کا انتظار کرتا۔

چند مہینوں کے بعد اس کی ہمت اتنی بڑھی کہ اس نے اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیا اور وہ بھی دن کی روشنی میں۔ اس دن وہ سب چرس پیے ہوۓ تھے چنانچہ انہوں نے کپڑے اتار کر Building کے گرد ایک چکر لگایا۔ اتفاقاً انہیں

ایک بوڑھی عورت نے دیکھ لیا۔ اس کے دوست تو بہت گھبرائے اور توبہ کی لیکن وہ جس راستے پر چل پڑا تھا وہاں سے واپس لوٹنا مشکل تھا۔

لیکن زندگی کے کئی راستوں کی طرح وہ راستے ایسی منزلوں پر جا نکلے جو بیک وقت خوف اور لذت کی علامت تھے۔ اسے شاید Dangerous Living کا شوق تھا۔ آخر وہ اس دشت حیرت میں پہنچ گیا جہاں واپس مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ خود اس طرز زندگی سے بیزار تھا لیکن بے بس بھی محسوس کرتا تھا۔ آخر جس دن پولیس نے اسے گرفتار کر کے جیل کی کوٹھری میں بند کیا اس دن اس نے سکھ کا سانس لیا اب وہ خلوص دل سے اپنی زندگی کو بدلنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔

میں اس دن واپس لوٹا تو رات بھر سوچتا رہا کہ میں کتنا سادہ ہوں۔ کتنا کم علم ہوں۔ زندگی کے نجانے کتنے ایسے رخ ہیں، ایسی گلیاں ہیں، ایسے راستے ہیں، ایسی شاہراہیں ہیں، ایسے راز ہیں، جن سے میں ناواقف ہوں۔ مجھے اس دن ایسا لگا، جیسے زندگی کی سطح کے نیچے بیسیوں تاریک جہاں آباد ہیں۔ میں تو صرف ایک ہی شہر گمنام میں بھٹکتے ہوئے گھبرا گیا تھا۔ لوگ نجانے کن کن آسیب زدہ شہروں سے ہو کر آئے تھے۔ اور پھر یا تو جیل خانوں میں یا پاگل خانوں میں بند کر دیے گئے تھے۔

گروپ میں شامل ہو کر مجھے کچھ سکون تو ہوا لیکن میرے مسائل میں کمی نہ آئی۔ میں اور میری بیوی اجنبیت کی دیواروں کو چاٹتے رہے۔ وہ ایک دن کہنے لگی کہ لوگ سینکڑوں سوال پوچھتے ہیں۔ میں انہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں لیکن تمہارا نام آتا ہے تو میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ہمارے راز مشترک ہیں۔ جب دو لوگ زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گزارتے ہیں تو ان کی حیثیت Joint Bank Account کی سی ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کی غیر موجودگی میں ساری گفتگو لنگڑی ہو جاتی ہے۔

مجھے لگتا کہ وہی عورت جو برسوں میری شریک حیات تھی اب مجھ سے ہاتھ ملانے کو بھی تیار نہ تھی۔ میری بیوی، میری بیوی کم اور ہمسائی زیادہ لگتی۔ میرے سینے میں بھی ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جگہ ایک برف کا تودہ رکھا تھا۔ آخر مجھ سے پوچھنے لگی کہ جب لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے کیوں جدا ہوئے ہو تو تم کیا کہتے ہو۔ میں نے کہا کہ اول تو لوگ مجھ سے پوچھتے ہی نہیں۔ کیونکہ میں لوگوں سے دور رہتا ہوں اور اگر پوچھیں بھی تو میں کہتا ہوں "It didn't Work Out" اور موضوع بدل دیتا ہوں مجھے احساس تھا کہ میری بیوی میری وجہ سے مجبور تھی اور میں اس کی وجہ سے۔ اور ہم دونوں عالم بے بسی میں معجزوں کے منتظر تھے ایسے معجزے جو آسمانوں سے اترنے بند ہو چکے تھے۔

میرے اور میری بیوی کے تعلقات اس مداری کی پٹاری بن گئے تھے جس میں سے کبھی سانپ نکل آتے، کبھی پھول اور کبھی ڈگڈگی۔ شاید فطرت ڈگڈگی بجا رہی تھی اور ہم دونوں بندروں کی طرح ناچ رہے تھے۔

میرے عورت ہونے کے اعلان کے بعد جو Pandora's Box کھلا تھا اس میں صرف بیوی کے مسائل ہی نہ تھے ملازمت کے مسائل بھی تھے۔ مجھے فیکٹری سے خط آنے لگے کہ تمہارے ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ تم Depression کا شکار ہو۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کب تک صحتیاب ہو گے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ میری بیماری کو حسب ضرورت لمبا کرتی رہیں یہ علیحدہ بات کہ طفل تسلیاں بھی دیتی رہیں۔ آپ نے کبھی مرض کو لاعلاج نہ قرار دیا اور میں نے کبھی Per-manent Disability کی درخواست نہ دی۔ اپنی مالی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں کوئی زور سے کھانستا بھی ہے تو پورے گاؤں کو پتہ چل جاتا ہے۔ میرا یہ اقرار کرنا میرے اور میری بیوی کے لئے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑنے سے کم نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کے پروفیسر نے کہا تھا کہ وہ میرے آپریشن کے

لئے اس وقت تک سفارش نہ کرے گا جب تک میں نے عورتوں کی طرح دو سال تک زندگی نہ گزار لی ہو۔

عورتوں کی طرح زندگی گزارنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ میں عورتوں کا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلوں۔ گھر سے باہر قدم رکھنے کے بارے میں سوچتے ہی میرے قدم دو دو من کے ہو جاتے۔

میں ایک مدت سے عورتوں کے Hormones کھا رہا تھا میں نے بال بڑھا لیے تھے۔

میری جلد نرم اور ملائم ہو رہی تھی۔

میرے پستان بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے تھے لیکن پھر بھی میں گھر سے باہر نکلتے ڈرتا تھا۔ میں نے بیسیوں بار کوشش کی کہ گھر سے رات کی تاریکی میں شہر کے جنگل میں کھو جاؤں لیکن خوف کی زنجیریں اتنی بھاری تھیں کہ میں اس خیال سے ہی پتھر کا بن جاتا۔

آخر آپ نے ایک مشورہ دیا جو مجھے بہت پسند آیا Haloween آنے والی تھی۔ ہیلووین کی رات ان بیڑیوں کو توڑنے کا اچھا موقع تھا۔ جن سے میں برس ہا برس بلکہ یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہو قرن ہا قرن سے الجھ رہا تھا۔ اسی دوران میری بیوی کے بھانجے نے جس سے میں کبھی کبھار ملتا تھا اور جس کی ملاقات سے میرے دل کے ویرانوں میں بے موسم کے پھول کھل اٹھتے تھے۔ کہنے لگا کہ وہ ہیلووین کی رات کو میرے ساتھ Trick or Treat پر جانا چاہتا ہے۔ وہ میرے لئے ایک سنہرا موقع تھا۔

ہیلووین کی رات مجھے بہت پسند تھی۔ ایسی رات جس میں نہ صرف فرشتے، شیطان، پریاں اور چڑیلیں گلیوں اور بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے بلکہ لوگوں کو اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس شام میں نے ایک عورت کا لباس زیب تن کیا اور بھانجے کو نتھے

فرشتے کے کپڑے پہنائے اور میں شام کے دھند لکے میں اس ننھے فرشتے کے ساتھ ان گلیوں اور بازاروں میں گھوما۔ جہاں مجھے دن کی روشنی میں ان کپڑوں میں گھومنے کی حسرت تھی۔

وہ ننھا فرشتہ میرا مسیحا نکلا۔

میں اس واقعہ کے بعد، جو حادثے سے کم نہ تھا چند دن تک ہواؤں میں اڑتا رہا لیکن وہ خوشی بھی میری ہر خوشی کی طرح چند روزہ تھی۔

اس ننھے فرشتے نے جب گھر والوں کو خوشی خوشی بتایا کہ میں عورت بنا تھا تو حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ وہ گاؤں جہاں چہ مہ گوئیوں کی آگ پہلے سے سلگ رہی تھی۔ اس کی خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ننھے فرشتے کی نانی نے اس کی ماں سے کہا کہ مسئلہ صرف ہیلووین کی رات کا نہیں، وہ شخص اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بعض پاگلوں کی طرح خطرناک بھی ہو۔ اس لئے تمہارا بچہ اس کی صحبت میں محفوظ نہیں۔ بس پھر کیا تھا وسوسوں کے ناگ گاؤں کے جنگل میں اتر گئے اور شکوک و شبہات کا زہر کینسر کے Cells کی طرح رشتہ داروں کے سراپا میں پھیل گیا۔ انہوں نے مجھ سے اس بچے کی مسکراہٹ چھین لی جو میری زندگی کے صحرا کا تنہا بادل تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں رات کی تاریکی میں گھر سے عورتوں کے کپڑے پہن کر نکلنے لگا لیکن میرے کرب کی ٹیسیں شدید سے شدید تر ہونے لگیں۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے بیوی سے جدائی کے بعد جو خواب دیکھے تھے ان کی حیثیت ایک پاگل کی بڑ سے زیادہ نہ تھی۔ مجھ میں خود ہی اتنی ہمت نہ تھی کہ بزدلی کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا اور ایک چوراہے پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے پاس آتا، دل کا غبار نکالتا اور چلا جاتا۔ آپ کی حیثیت اس سرجن کی طرح تھی جو ہر ہفتے مریض کے زخموں اور ناسوروں سے پیپ نکال دیتا ہے اور پھر وہ پیپ

دوبارہ بھرنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ اسی لئے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو جاتا۔ آپ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہیں کہ میں منزل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہوں۔ آپ مجھے خرگوش اور کچھوے کی مثال دیتی رہیں لیکن مجھے اسی سست رفتاری سے خوف آتا رہا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے مصائب کی رات اتنی لمبی ہے کہ میری موت کی منزل میری خوشیوں کی سحر سے قریب تر ہے۔

لیکن پھر وہی ہوا۔ میں تھا اور زندگی کا دام فریب۔ جہاں مایوسیوں کی تاریکی حد سے بڑھی امید کی کوئی کرن کسی کونے سے نکل آئی۔

ہمارے گروپ میں ایک مہمان کا اضافہ ہوا لیکن وہ مہمان باقی سب مہمانوں سے جدا تھا۔ اس کی شجاعت، اس کا حوصلہ، اس کی لگن اور اس کا نقطہ نظر، سب کے لئے ایک تازیانہ تھا۔ وہ عجیب و غریب تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے خاندان کی خاردار جھاڑیوں میں ایک سبزۂ بیگانہ کی طرح پلا بڑھا تھا وہ دوسروں کی آنکھوں میں اپنے آپ کو تلاش کر تا رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ اپنی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک بیگ میں Jeans کی دو قمیصیں اور پتلونیں ڈالیں اور چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کا رخت سفر جتنا کم ہوتا اتنا ہی وہ ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔

وہ دنیا کے کونے کونے میں پھرا۔ مختلف شہروں میں، بستیوں میں، جنگلوں میں، صحراؤں میں گھوما۔ اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنی ذات میں جذب کرتا رہا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ ایسی بستیوں کو دیکھ کر آیا ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک ہی گھر، ایک ہی گاؤں اور ایک ہی شہر میں رہ کر بھی علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں بستے ہیں۔ لڑکیوں کے اسکول علیحدہ، لڑکوں کے کالج علیحدہ، عورتوں کے کام کی

جگہ علیحدہ، مردوں کے کھیل کے میدان علیحدہ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں قید ہو گئے تھے اور قوانین اور روایات نے شہروں کو جیلوں میں بدل دیا تھا۔

بعض شہروں میں مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی قربت سے اتنے محروم ہوئے تھے کہ ہم جنسی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ بچوں کی عصمت بھی محفوظ نہ رہی تھی۔ ان علتوں میں کئی اساتذہ اور کئی مذہبی رہنما پکڑے گئے تھے۔ جنہوں نے بچوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے دیہاتوں سے گزرا تھا جہاں جہالت کی ملکہ کی حکمرانی تھی۔ نوجوان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے جسموں سے کیا اپنے جسموں سے بھی ناواقف تھے۔ وہ اب بھی سمجھتے تھے کہ مشت زنی سے انسان کی نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ عورتیں مردوں کے بوسے دینے سے حاملہ ہو جاتی ہیں۔ حیض میں مباشرت کرنے سے انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

وہ یہ نہ جانتے تھے کہ عورتیں مہینے میں صرف دو یا تین دن حاملہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عورتوں کے آج بھی ختنے کئے جاتے تھے اور لوگ بعض انسانوں کو ہیجڑا کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس نے ہزاروں بے اولاد عورتوں کو پیروں فقیروں کی قبروں پر نمک کھاتے، جھاڑو دیتے اور منتیں مانتے دیکھا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ جب لوگ زندہ انسانوں کو چھوڑ کر مردہ قبروں سے امیدیں لگائے بیٹھے رہیں تو انسانوں کی زندگیوں میں قبروں کی تاریکی اتر آتی ہے۔ انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود نابینا، کان رکھ کر بھی بہرے اور زبان رکھ کر بھی گونگے ہو جاتے ہیں اور اپنے فرسودہ عقائد کے دھندلکوں میں ایسے کھوتے ہیں کہ درخت گنتے گنتے جنگل ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

اس مرد جہاندیدہ کا یہ فلسفۂ حیات تھا کہ زندگی میں کوئی چیز بغیر قربانی

کے حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گھر واپس آکر اپنی کار، اپنی دکان اور اپنی جائداد بیچ دے گا تاکہ اتنی دولت جمع کر سکے کہ جنس بدلنے کا آپریشن کروا سکے۔ اس نے دنیا کے ایسے سنٹروں کی فہرست تیار کر لی تھی جہاں ڈاکٹروں اور نرسوں کی خدمات ڈالروں سے خریدی جا سکتی ہیں اور جہاں ڈالر کی کنجی بہت سے تالوں کو کھول دیتی ہے۔

مجھے اس شخص کی جو بات سب سے اچھی لگی وہ اس کا ذہنی مریضوں کو زندگی کے سوتیلے بچے کہہ کر بلانا تھا ایسے سوتیلے بچے جن سے فطرت اور خدا نے ہی نہیں انسانوں نے بھی آنکھیں موڑ لی تھیں۔

میں اس ہمسفر کی باتیں سننے کے بعد کئی دن تک سو نہ سکا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں اسکی منزل تک پہنچنے کے لئے جن قربانیوں کی ضرورت ہے ان سے میرا دل خالی ہے اور جن ڈالروں کی ضرورت ہے ان سے میری جیب خالی ہے۔

آخر میں گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اسکی گہما گہمی میں کھو گیا۔ میرا خیال تھا کہ انسان شہر میں گمنامی کی زندگی گزار سکتا ہے۔ شہروں کی بھیڑ میں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ نفسا نفسی کا وہ عالم ہوتا ہے کہ ہمسایے کو نہیں پہچانتا۔ اور وہ ماحول جو عام لوگوں کے لئے سوہان روح ہوتا ہے زندگی کے سوتیلے بچوں کیلئے رحمت کا کام کرتا ہے۔

میں شہر تو چلا آیا لیکن نان شبینہ کا محتاج ہو گیا۔ گاؤں میں عورتوں کی طرح کام کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اسی فیکٹری میں کام کرتا جس میں میری بیوی کام کرتی تھی جو میرے ضمیر کو گوارا نہ تھا۔

میں جس دن سے شہر آیا ہوں۔ بے روزگاری کی چادر اوڑھے پھر رہا ہوں۔ میری زندگی گلیوں کے کتوں سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ

بے روزگاری انسان کو ذلیل و خوار ہی نہیں اسکی روح کو داغدار بھی کر دیتی ہے۔

میں جو خواب لے کر گاؤں سے چلا تھا وہ شہر کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے۔ ہر گلی میں خوف، ہر سڑک پر ہراس اور ہر موڑ پر ذلت، میری راہ روکے کھڑے تھے۔

کہاں وہ گاؤں جہاں میں واحد Transexual تھا اور کہاں یہ شہر جہاں انہوں نے دو کلب بنا رکھے ہیں۔ میں کئی دفعہ ان سے ملنے گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لیکن وہ آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے۔ نجانے کتنے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور کتنوں نے خودکشی کی آغوش میں پناہ لی تھی۔

آخر مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کے پروفیسر کی باتیں فریب سے زیادہ نہ تھیں آپ کا ادارہ علاج کا ادارہ نہ تھا، ریسرچ کا ادارہ تھا جو ہر سال بیسیوں ریسرچ پیپر چھاپ کر خوش ہو جاتا تھا۔ آپ کا کام مریضوں کو جھوٹی تسلیاں دینا تھا اور لوگوں کو حتی الامکان اپنے کرب کو برداشت کرنا سکھانا تھا۔

میری ناامیدیاں اور مایوسیاں غصے اور نفرت کا روپ دھارنے لگیں اور میں کھمبوں اور راہ چلتے کتوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔

ہارمونز کھانے کا اثر یہ ہوا کہ میرے پستان بڑھ گئے، آواز قدرے نسوانی ہو گئی لیکن پھر میرے سارے جسم پر دانے نکل آئے۔ میں انہیں کھجاتا تو خون نکلنے لگتا آپ مرہم دیتے تو چند دنوں کے لئے افاقہ ہو جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرا سراپا ناسور بن گیا ہو۔

میں نے (Driver's License) بدلنا چاہا تو وہ میرا نام تو بدلنے کو تیار ہو گئے لیکن انہوں نے میری جنس کو اس وقت تک بدلنے سے انکار کر دیا جب تک کہ میں آپریشن نہ کروالوں۔

پھر ایک دن میں نے اخبار میں ایک Transexual کی درد بھری کہانی پڑھی جو مذہبی جنون کا شکار تھا۔ اسکی اپنے ہمسایے سے ہاتھاپائی ہو گئی تھی جو اسکا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا تو جج نے اسے دو مہینے جیل کی سزا دی۔ اس نے مردوں کی جیل میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتوں کی جیل میں جانا چاہتا تھا اور جب اسے زبردستی مردوں کی جیل میں بند کیا گیا۔ تو چند دن بعد وہ اپنا Pe-nis کاٹتے ہوئے لہو میں لتھڑا ہوا پکڑا گیا۔ جیل کے سپرینٹنڈنٹ نے اسے پاگل خانے بھیج دیا۔ ہسپتال میں جب ڈاکٹر نے اس سے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر دیا جس پر انجیل کی یہ آیت لکھی تھی:

"There are Eunuchs Born that Way from their Mother's Womb, There are Euruchs made so by men are there are Eunuchs who have made themselves that way for the sake of Kingdom of Heaven"

(Mathew 19:12)

ڈاکٹر نے اس شخص کو بتایا کہ اس آیت کا اشارہ رہبانیت کی طرف تھا نہ کہ خود کو خصی کرنے کی طرف۔ لیکن اس شخص نے اس آیت کی وہ تفسیر قبول نہ کی اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی آسمانی کتابوں کی آیتوں کی تفسیر پر بھلا کب اتفاق الرائے ہوا ہے۔

وہ ہسپتال میں بھی مصر تھا کہ اسے عورتوں کے حصے میں رکھا جائے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ میری باتیں سن کر تھک گئی ہیں۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا ایک دو باتیں اور ہیں اسکے بعد میں رخصت چاہوں گا۔ میں آپ کے صبر و تحمل کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔

تقریباً دو ہفتے پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

فنکار ایک بت بنا رہا ہے وہ مرد کا بت ہے لیکن اس کے مداح ایک عورت کا بت چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ بت کا Penis ہتھوڑے کی ضربوں سے توڑ دیتا ہے اور اسکی جگہ بت کے پستان بنا دیتا ہے اور ایک خوبصورت مجسمہ تیار کر دیتا ہے۔

میں نے اگلے دن اپنے Penis میں ایک کیتھر ڈال دیا اور اسے آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک مرحلے پر میں بیہوش ہو گیا ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔

انسان بعض دفعہ اتنا مجبور محسوس کرتا ہے کہ خودکشی اختیار و ارادہ کی آخری علامت بن جاتی ہے۔

میں اس حادثے کے اثر سے ابھی پوری طرح نکلا نہ تھا کہ مجھے کل خبر ملی کہ وہ ننھا فرشتہ جسے مدتوں پہلے خاندان نے مجھ سے جدا کر دیا تھا Leukemia سے مر گیا ہے اور مجھے کسی نے خبر تک نہ دی۔

وہ مجھے اس سے دور رکھ سکتے تھے اس کی قبر سے نہیں۔ آج صبح جب مجھے چند لوگوں نے جگایا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ننھے فرشتے کی قبر پر ساری رات سویا رہا تھا۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے ان پریشان خیالات کو کہیں محفوظ کر لیں گی۔

لیکن جانے سے پہلے میں اپنی آخری خواہش، آخری آرزو، آخری تمنا یا یوں کہیں کہ آخری وصیت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں، میں چاہتا ہوں کہ جب آپ مجھے ننھے فرشتے کے پہلو میں دفن کریں تو میری قبر پر جلی حروف سے لکھ دیں کہ :

''اس جگہ ایک ایسی عورت دفن ہے جسے ساری عمر لوگ مرد سمجھتے رہے''

چونکہ یہ میری آخری ملاقات ہے اسلئے کیوں نہ ہم پہلی اور آخری دفعہ گلے مل لیں۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آپ کی طویل خاموشی میرا سہارا بھی تھی اور اس بات کی دلیل بھی کہ کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے اور ثابت کرے کہ میرا وجود زندگی کے لئے ضروری ہے۔

دسمبر ۱۹۹۰ء

کچے
دھاگے

میں ہر روز شام کو جورج سے ملنے ہسپتال چلا جاتا، گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھا رہتا اور پھر دل شکستہ گھر لوٹ آتا۔ بعض دفعہ تو تھکاوٹ اتنا نڈھال کردیتی کہ سر میں درد ہونے لگتا۔ گھر میں شمسہ میرے سر کو دباتی۔ مجھے دودھ کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں دیتی اور میں سو جاتا۔ لیکن پھر آدھی رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور پھر بقیہ رات کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔

''جورج کی بیماری تمہیں بھی بیمار کردے گی'' شمسہ مجھے سمجھاتی لیکن میں اس کی باتوں کو نظر انداز کردیتا۔ ان تین مہینوں میں، جبکی ہر شام میں نے جورج کے کمرے میں گزاری تھی اس کا نہ کوئی اور دوست، نہ رشتہ دار اور نہ ہی رفیق کار اس کی تیمارداری کرنے آیا تھا، جورج کی بیماری اسے گھن کی طرح کھا گئی تھی اور اسے بستر مرگ پر گھسیٹ لائی تھی۔

''کیا میرا تو یہ حشر نہ ہوگا؟'' مجھے یہ خیال آتا تو میرے سراپا میں کپکپی دوڑ جاتی۔ میں نے جورج کو زینہ بہ زینہ زندگی کی قبر میں اترتے دیکھا تھا۔ اس کے من کے سورج کو، جو ابھی پوری طرح چمکا بھی نہ تھا گرہن لگ گیا تھا۔ اس کی

آنکھیں، جو ہر لمحہ مسکراتی رہتی تھیں، روٹھ گئی تھیں۔ اسکے گال، جو شرارت سے سرخ رہتے تھے، اندر کو دھنسنے لگے تھے۔ اسکی گردن، جو خم دار تھی، سوکھی شاخ بن گئی تھی اس کے ہونٹ، جو بوسوں سے شاداب رہتے تھے، ویران ہو گئے تھے۔ اسکا سراپا، جو خوبصورتی اور وجاہت کی زندہ مثال ہوا کرتا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

اس کی زندگی کا درخت پھلوں، پھولوں اور پتیوں سے محروم ہو گیا تھا اور اپنی عریانی اور بے بسی پہ نادم تھا۔

اسکی سانسیں اکھڑی اکھڑی رہتیں۔

موت اپنا دامن وا کئے اس کا انتظار کر رہی تھی اور وہ ہسپتال کے کمرے میں لیٹا زندگی کو الوداع کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں جب پہلی دفعہ جورج سے ملا تھا تو اس کی ذہانت اور حسن ظرافت سے متاثر ہوا تھا۔ ہم کچھ دوست ایک پارٹی میں لطیفے سنا رہے تھے جب کسی نے کہا ''سنا ہے جورج بھی اس محفل میں آیا ہے۔ اس سے ملے عرصہ بیت گیا ہے اس کے قہقہے دور سے پہچانے جاتے ہیں'' تو اچانک جورج آ گیا۔

"Think of the Devil and there he Blows" جورج نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا اور سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ ''میں Devil ہوں۔ لوگ مجھے جورج کہتے ہیں'' ''میں پیغمبر ہوں'' اور لوگ مجھے شعیب کہتے ہیں'' میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر تو ہم دونوں کی خوب نبھے گی''

وہ دراز قد انسان تھا، قدرے فربہ جسم، گھنگھریالے سنہرے بال، چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت۔ ''انگریزی زبان بہت متعصب ہے'' وہ پھر بولا ''وہ کس طرح؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے مردوں نے اور وہ بھی Straight مردوں نے وضع کیا ہے''

''میں سمجھا نہیں''

'انگریزی میں جب He کہتے ہیں تو اس میں عورتیں شامل ہوتی ہیں لیکن جب She کہتے ہیں تو اس میں مرد شامل نہیں ہوتے۔

''اور سٹریٹ مردوں کی کس طرح ؟''

''اگر انگریزی Gay مردوں نے بنائی ہوتی تو اس میں Back Seat Driver 'Backward اور Behind my back جیسے Expressions کے مفہوم مختلف ہوتے۔

''لیکن اردو کا بھی یہی حال ہے''

''وہ کس طرح ؟'' جورج متوجہ ہوا

''اس میں بھی مردانہ وار مقابلہ اور پیٹھ پیچھے برائی جیسے Expres-sions ہیں''۔

اور ہم دونوں ہنس دیے جیسے ہم دونوں کا Wavelength ایک جیسا ہو۔

اس کے بعد جورج مجھ سے بات چیت کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران پوچھنے لگا۔ ''آپ کون سا کھیل کھیلتے ہیں ؟''

''ٹینس''

''میرے پاس ایک T-Shirt ہے۔ میں وہ آپ کو دوں گا''

''اس کی کیا خصوصیت ہے ؟''

''اس پر لکھا ہے ......

For Tennis Players Love Means Nothing

اور ہم دونوں مسکرا دیے۔ جورج کہنے لگا کہ وہ بھی ٹینس کھیلتا ہے اور اسے ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ چنانچہ ہم نے اکٹھے ٹینس کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ میں انسانی رشتوں کی کس پگڈنڈی پر چل نکلا ہوں۔

اگلے چند مہینے ہم ہر ہفتے ٹینس کھیلنے لگے۔ ایک ہفتے وہ میرے گھر آجاتا اور دوسرے ہفتے میں اس کے گھر چلا جاتا۔ جورج نہایت دلچسپ آدمی تھا۔ وہ ہر

ہفتے کوئی نیا شوشہ چھوڑتا۔ ایک دن کہنے لگا۔ ''انگریزی زبان گوروں نے بنائی ہے''

''وہ کس طرح؟''

''وہ ناپسندیدہ چیز کو کالا بنا دیتے ہیں''

''مثلاً؟''

Black Market, Black Money" اور Black Sheep وغیرہ۔

''ہندوستان میں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا بدشگونی سمجھا جاتا ہے اور صدقہ دیتے وقت کالا بکرا ذبح کیا جاتا ہے''۔

جورج کو اقلیتوں کا بڑا خیال رہتا۔ چاہے وہ عورتیں ہوں، کالے ہوں یا Gay لوگ۔ ان سب کے لیے اس کا ہمدردانہ دل دھڑکتا رہتا تھا۔ اس کی ہنسی، مذاق کے نیچے ایک نہایت ہی مخلص اور سنجیدہ دوست چھپا ہوا تھا۔

وہ ایک دفعہ مجھے ملنے آیا تو میں نے اسے سیخ کباب کھلائے۔ اسے بہت پسند آئے۔ وہ انہیں پاکستانی ہاٹ ڈاگ کہا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے لسی پیش کی۔ وہ بھی اسے بہت پسند آئی۔ میں نے چینی ڈال کر اور اس نے نمک ڈال کر پی۔

ایک دفعہ میری والدہ نے مجھے دو ململ کے کرتے بھیجے تو ان میں سے ایک میں نے جورج کو تحفتاً پیش کر دیا۔ وہ اسے لے کر کافی دیر تک ناچتا رہا۔ پھر بولا ''پاکستانی عورتیں مردوں کو بھائی بنا لیتی ہیں۔ تم بھی کہیں یہ حماقت نہ کر لینا''۔

''وہ تو عزت کی بات ہے''

''عزت کی نہیں منافقت کی بات ہے''

اور ہم دونوں ہنس دیے۔

☆☆

ایک دن جب ہم ٹینس کھیل رہے تھے تو میں فرش پر پھسل گیا اور میرے پاؤں میں موچ آئی۔ میری کمر کے پٹھے بھی کھنچ گئے اس نے فوراً مجھے اپنے

بازوؤں میں اٹھایا اور کار میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ پہلے اس نے میرے جوتے اور موزے اتارے، میرے پاؤں پر مرہم لگائی۔ پھر میری ٹانگ پر مالش کی اور آخر میں مجھے بستر پر لٹا کر میرے سارے بدن کو Massage کیا۔

نجانے وہ میری تھکاوٹ تھی، اس کا لمس تھا، یا ہمارے رشتے کی حدت کہ نہ صرف میرے جسم کا درد دور ہو گیا بلکہ میرے سراپا میں ایک بے نام سی لہر دوڑ گئی۔ ہماری قربتوں نے نیا موڑ لیا اور جب اس نے میرے سراپا کو اپنے بوسوں سے چھوا تو میں ایک نئی لذت سے سرشار ہوا۔ ایسی لذت جو عورتوں کی قربت کی لذت سے مشابہ بھی تھی اور مختلف بھی۔ جورج کہنے لگا کہ ایک وہ دور ہوا کرتا تھا جب انسان آدھا مرد تھا اور آدھی عورت۔ یونانی دیومالا میں اس کا ذکر آیا ہے اور پھر انسان پر خداوند زیوس کا قہر نازل ہوا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس دن سے عورت مرد کی اور مرد عورت کی تلاش میں ہے لیکن جورج کا خیال تھا کہ ہر عورت میں مرد اور ہر مرد میں عورت پوشیدہ ہے۔

اس شام جورج کی لمس سے میرے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی جس سے مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی اور پریشانی بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے گھر کے تہ خانے سے ایک خزانہ نکل آیا ہو لیکن ایسا خزانہ جس کے چاروں طرف سانپ پھنکار رہے ہوں۔ اس واقعہ کے بعد کئی دفعہ جورج میرے ہاں اور میں اس کے ہاں رات بھی رکے۔ ہمارے رشتے میں، دوستی اور محبت آپس میں بغلگیر ہو گئے تھے۔

☆☆☆
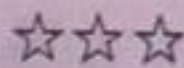
اور پھر ایک دن جذبات کا شیش محل چکنا چور ہو گیا۔

جورج نے مجھے ایک ایسی محفل میں جانے کی دعوت دی جس میں صرف

Gays اور Lesbians مدعو تھے۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شخص جو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا تیخ پا ہو گیا۔ ''آخر تم کیوں نہیں جانا چاہتے'' اس نے پوچھا۔

''میرا جی نہیں چاہتا۔ تمہارا اور میرا رشتہ ذاتی ہے۔ ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے''

''کیا تم اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ پارٹیوں میں جاتے تھے یا نہیں''

''ہاں جاتا تھا''

''تو میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے''

''تم ہمارے تعلقات کو مشتہر کرنا چاہتے ہو''۔

''شعیب!'' وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح کمرے میں تیز تیز چل رہا تھا۔

''خلوص کسی سے نہیں ڈرتا۔

عشق بے خوف ہوتا ہے۔ انسانی رشتے قربانیوں سے پنپتے ہیں۔

اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ عشق نہیں۔

ہوس ہے ہوس''

''تم میرے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو میں اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا''۔

اور میں اٹھ کر چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد نہ میں جورج کے ہاں ٹھہرا اور نہ ہی جورج نے میرے ہاں رات گزاری۔

ہمارے تعلقات جو دوستی سے شروع ہوئے تھے دوستی پر ہی آکر رک گئے۔

جورج کا خیال تھا کہ میں مغربی دنیا کے لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر دیکھنے سے گھبرا رہا تھا اسے کیا خبر تھی کہ میرے دل میں ابھی مشرقی دنیا کے بیسیوں بت چھپے بیٹھے تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران جورج کو Bill مل گیا اور میری شمسہ سے ملاقات ہوئی۔

شمسہ اگرچہ ایک مذہبی گھرانے میں پلی بڑھی تھی لیکن اس کی یونیورسٹی کی تعلیم، زندگی کے تجربات اور دنیا کی سیر نے اسے ایک وسیع النظر انسان بنا دیا تھا۔

ایک دن میں نے شمسہ سے کہا "میں چاہتا ہوں تم میرے دوست جورج سے ملو"

"اس کے بارے میں کچھ بتاؤ"

"وہ نہایت نفیس انسان ہے، مخلص دوست ہے، اسکول ٹیچر ہے اور Gay ہے"

"کیا اکیلا رہتا ہے؟"

"نہیں اپنے Lover بل کے ساتھ" "میں چاہتا ہوں کسی دن جورج کو ڈنر پر بلاؤں"

"ضرور! جورج کو اکیلے کیوں بلاتے ہو۔ بل کو بھی بلا لو"

میں شمسہ کے اس جواب سے حیران ہوا تھا۔ میں نے شمسہ کو Under-stimate کیا تھا۔ وہ میری توقعات سے زیادہ فراخ دل تھی۔

شمسہ جورج اور بل سے ملی۔ اس نے دونوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان کی پذیرائی کی بلکہ جب میں جورج سے تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ وہ بل سے گپ لگا رہی تھی دونوں شمسہ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے جاتے ہوئے اسے کھانے پر بھی بلایا تھا۔

ویسے تو میں جورج سے اکثر ملتا رہتا لیکن کبھی کبھار ہم چاروں بھی اکٹھے ہو جاتے اور کافی گپ شپ رہتی۔ آخر ایک دن جورج نے مجھے اپنے گھر بلایا وہ

اکیلا بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے کبھی جورج کو اس حالت میں نہ دیکھا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے Aids ہو گیا ہے''

''کب بتایا؟''

''آج ہی''

مجھ پر جیسے بجلی گری۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن مجھے جورج کے ساتھ ساتھ اپنی اور شمسہ کی فکر بھی دامن گیر ہو گئی۔

''ابھی کسی کو بتانا نہیں'' جورج نے درخواست کی۔

''اچھا''

''بل کو بھی نہیں''

''اچھا''

مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ جورج مجھ پر بل سے زیادہ اعتبار کر رہا تھا۔

''ایک لحاظ سے دوست محبوب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں'' میں نے سوچا۔ میں اگلے دن اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ سو چکا تھا جسے ایڈز ہو گیا ہے۔

میں چند دن تک گم سم رہا۔ شمسہ نے کئی دفعہ پوچھا لیکن میں نے طبیعت کی خرابی اور سر درد کا بہانہ کر دیا۔ وہ بھی تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

چند مہینوں کے بعد جورج کو ہسپتال داخل ہونا پڑا اور پھر اس کا راز سورج بن کر سب کے سروں پر چمکا لیکن وہ سورج عذاب کا سورج تھا جس نے سب رشتے جلا کر راکھ کر ڈالے۔

سب سے پہلے اسکول والوں کو پتہ چلا کہ جورج کو ایڈز ہو گیا ہے اور

اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس نے لاکھ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کسی کو چھونے سے ایڈز نہیں پھیلتا لیکن اس کی بات کوئی سننے والا نہیں تھا۔ بچوں کے والدین نے احتجاج کیا۔ اخبار میں خبریں چھپیں اور اسے بر طرف کر دیا گیا۔

خبر کا چھپنا تھا کہ جورج کے خاندان کو پتہ چلا اور اس کے والدین نے اسے عاق کر دیا۔ اسکے والد کا خط آیا جس میں لکھا تھا ''ہمیں امید نہ تھی کہ ایک دن تم شہر میں ہمیں یوں بدنام کرو گے''

آہستہ آہستہ اس کے دوست اس سے کنارہ کش ہو گئے اور آخر بل بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے شمسہ کو بتایا تو وہ بولی ''بیچارا بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے''

شمسہ کی ہمدردی سے مجھے ایک دفعہ پھر حیرانی ہوئی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ رحمدل بھی تھی۔

جورج کو جس دن ہسپتال جانا تھا وہ ایک سوگوار دن تھا۔ میں اور جورج کافی دیر تک ہسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھے رہے۔ پہلے تو ڈاکٹر اور نرس بڑی ہمدردی سے ملے لیکن جونہی انہیں پتہ چلا کہ جورج ایڈز کا مریض ہے ان کے چہروں پر سرد مہری کا غلاف چڑھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر لی ہوں۔ پہلے جورج کو دوسری منزل کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت روز بروز دگرگوں ہوتی جا رہی ہے تو اسے چوتھی منزل پر ایڈز وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔

میں ہر شام اس سے ملنے جاتا لیکن اکثر اوقات وہ یا تو سو رہا ہوتا یا بیہوش ہوتا۔ میں اس سے زیادہ اس کی نرس سنتھیا سے بات چیت کرتا۔ جو بہت ہمدرد عورت تھی اور اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔

سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اور بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا لیکن پھر کہنے لگی ''وہ تمہیں بہت عزیز رکھتا ہے''

''تم کیسے جانتی ہو؟''

''تمہارا نام لیتا ہے تو اس کے بیمار چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے''

میں سنتھیا کے رویے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں اسی سے پوچھنے لگا:

''تمہیں یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''ہسپتال میں تو پندرہ سال ہو گئے ہیں لیکن ایڈز وارڈ میں پانچ سال۔ میں اس دن سے یہاں کام کر رہی ہوں جس دن سے یہ وارڈ کھلا تھا''

ان پانچ سالوں میں کیا کوئی فرق آیا ہے؟

''بہت فرق۔ مریضوں میں بھی۔ نرسوں میں بھی۔ مریضوں کے خاندانوں کے خاندانوں میں بھی اور عوام میں بھی''

''کس قسم کا فرق؟''

''پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ Gay لوگوں کی بیماری ہے، افریقہ سے آئی اور جنسی تعلقات سے پھیلی ہے۔ آہستہ آہستہ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ امریکہ میں بھی اتنی ہی ہے جتنی افریقہ میں اور یہ صرف جنسی تعلقات سے ہی نہیں، جسم کی کسی رطوبت (Body Fluid) سے بھی پھیل سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے وارڈ میں پانچ بچے داخل ہیں۔ ان میں سے دو Hemophilia کے مریض ہیں جنہیں خون سے یہ بیماری ملی ہے اور بہت سے بچے تو ماں کے پیٹ سے یہ بیماری لے کر آتے ہیں''

''لوگوں کے رویے میں کیا فرق آیا ہے؟''

''لوگوں کو آہستہ آہستہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ لوگ نہ تو مجرم ہیں نہ گنہگار یہ مریض ہیں اور انہیں ہمدردی کی ضرورت ہے، غصے اور نفرت کی نہیں''

ہم ابھی یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ جورج جاگ گیا۔ میں نے اور سنتھیا نے مل کر اس کی مدد کی اور وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے زرد بیمار چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

''مجھے تمہاری لسی بہت یاد آتی ہے۔ اگلی دفعہ لے کر آنا۔ تم میٹھی پینا، میں نمکین پیوں گا''

''بہت اچھا''

''اور میرا کرتا بھی لے کر آنا''

''لیکن تم تو بھائی نہیں بننا چاہتے تھے''

''چلو بہن بنا لینا''

اور ہم دونوں مسکرا دیے۔ پھر وہ اچانک بہت جذباتی ہو گیا۔

''شعیب! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔''

''میں نے بھی'

''تم نے کیا سیکھا ہے''اس نے پوچھا

''محبت کرنے کے لیے انسان کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں''۔ اور تم نے؟

''دوستی محبت سے بھی عظیم تر جذبہ ہے''

اور پھر وہ منہ موڑ کر لیٹ گیا۔ تکیے میں اس کے آنسو جذب ہو رہے تھے۔

وہ میرے اور جورج کی آخری گفتگو تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ جورج چند دنوں کا مہمان ہے۔

اگلے دن سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج کی خواہش تھی کہ میں چند دن کے لئے کام سے چھٹی لے لوں اور اس کے پاس رہوں تاکہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس کے پاس موجود ہوں۔

اس شام میں شمسہ کی گود میں سر رکھے رو رہا تھا۔

تم رو کیوں رہے ہو''شمسہ نے پوچھا

''میرے دل پر بھاری بوجھ ہے۔ میرا دوست مر رہا ہے''

''شعیب! مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں۔ تم نہایت ہی خود غرض انسان ہو''میں اس حملے کے لئے تیار نہ تھا۔

''' ''' '''

''تم خود غرض ہی نہیں بزدل اور ذلیل بھی ہو''

''خیریت''میں حیران پریشان تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی بیوقوف لڑکی ہوں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں میں جانتی ہوں کہ جورج تمہارا دوست ہی نہیں، محبوب بھی تھا''

''وہ کیسے؟''

''پہلے دن ہی جو میں ان سے ملی تھی، میں نے بل کی آنکھوں میں تمہارے لیے حسد کی چنگاریاں دیکھ لی تھیں اور میں اتنی نادان بھی نہیں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ جب سے جورج کو ایڈز ہوا ہے تم ہمیشہ Condom کیوں استعمال کرتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی ہمت اور جرأت ہوتی تو تم مجھ سے کھل کر بات کرتے۔ میں نے تم سے کئی دفعہ پوچھا لیکن تم نے موضوع بدل دیا''

''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے ایڈز ٹیسٹ کروایا ہے اور وہ منفی ہے''

میرے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''میں کئی ہفتوں سے غصے میں پھنک رہی تھی۔ کئی دفعہ سوچا کہ تم جیسے ذلیل آدمی کو چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن۔۔۔۔۔۔۔''

اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلے دن شمسہ نے آکر میرے گردن میں بازو ڈال دیے''

لیکن۔۔۔؟''میں نے پوچھا

''مجھے تم سے محبت ہے اور جورج سے ہمدردی۔۔۔میں نے اپنا ٹیسٹ بھی کروایا ہے وہ بھی منفی ہے''

''میں ڈر رہا تھا''

''کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی''

میں خاموش رہا

”میرا خیال ہے تم دفتر سے چھٹی لو اور جورج کی جی بھر کر تیمارداری کرو“

”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔“

میری زبان میں ہکلاہٹ پیدا ہونے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا“

”بعض دفعہ ایڈز کی بیماری کئی سالوں کے بعد ظاہر ہوتی ہے“

”جب ہم اس دریا پر پہنچیں گے تو اسے بھی پار کر لیں گے“

میں نے شمسہ کو گلے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شمسہ نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میری روح کا کانٹا نکال لیا ہو۔

دیواروں
پر
لٹکی
تصویریں

میں نے جب پہلی دفعہ اپنے کلینک کی دیواروں پر قدرتی مناظر کی تصویریں لٹکائی تھیں تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا کوئی تعلق نفسیاتی علاج سے بھی ہو سکتا ہے لیکن Natalie نے مجھے ان کے بارے میں نئے زاویوں سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں قدرتی مناظر کا بچپن سے شیدائی رہا ہوں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ میرا بچپن شہر کی فضا سے چند میل دور ایسے علاقے میں گزرا ہے جہاں ہمارے گھر کے ایک طرف نہر تھی، دوسری طرف پھلوں کے باغات تھے اور تیسری طرف کھیت ہی کھیت اور میں اکثر اوقات ان کھیتوں اور باغوں میں سیر کرنے، کھیل کھیلنے اور پھل جمع کرنے چلا جایا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کے پاس عید گاہ کا کھلا میدان بھی تھا جو گھنے درختوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں کئی دفعہ اپنی کتاب لے کر کسی درخت پر چڑھ جاتا اور میرے دوست مجھے چاروں طرف تلاش کرتے رہتے۔

کہتے ہیں انسان کا جس ماحول میں بچپن گزرا ہو وہ ساری عمر ویسے ہی

ماحول کی تلاش میں رہتا ہے۔ چنانچہ چند سال پہلے جب میں نے ٹورانٹو آنے کا فیصلہ کیا تو لاکھوں شہریوں، ہزاروں کاروں اور بیسیوں فیکٹریوں سے بھرے شہر میں کام کرنے اور رہنے کی بجائے میں ایسے ہسپتال کی تلاش میں نکلا جو شہر کے اندر بھی نہ ہو اور بہت دور بھی نہ ہو۔ دوستوں نے بتایا کہ Whitby شہر میں جو ٹورانٹو شہر سے تیس میل دور ہے ایک خوبصورت ہسپتال ہے چنانچہ میں اس کی سیر کو چل دیا۔ Whitby کا نفسیاتی ہسپتال Ontario کی جھیل کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا اور وہ جھیل سمندر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ہسپتال کے چاروں طرف کھلے میدان تھے جو درختوں سے بھرے پڑے تھے اور ان درختوں کے سائے میں Ca-nadian Geese اور Sea Gulls استراحت کر رہے تھے۔ میں نے اس فضا کو اتنا سکون پایا کہ میں ہسپتال کے چیف کے دفتر میں پہنچ گیا اور اپنا تعارف کروانے کے بعد انہیں بتایا کہ میں اس ہسپتال کی اردگرد فضا سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ وہاں کام کرنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں ڈاکٹر چینگ ہسپتال کے چیف تھے وہ مجھ سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ کہنے لگے ''آپ کل ہی سے کام شروع کر دیں''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ پہلے میں Saint John جا کر استعفیٰ دونگا پھر کام شروع کر سکوں گا'' چنانچہ ہمارا معاہدہ ہو گیا اور میں نے جنوری ۱۹۸۴ء میں Whitby کے نفسیاتی ہسپتال میں کام کرنا شروع کر دیا۔

قدرتی مناظر سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ مجھے تصویریں کھینچنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ میں ہر سال سینکڑوں تصویریں کھینچتا اور اپنے البموں میں لگاتا۔ میں نے پاکستان جا کر اپنے بچپن کی تصویریں بھی جمع کر رکھی تھیں اور انھیں بھی اپنے البموں میں لگا رکھا تھا لیکن میں فوٹوگرافی کے فن سے ناواقف تھا۔ میرے کئی دوست مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اگر تمہیں فوٹوگرافی سے اتنی ہی دلچسپی ہے اور ہر سال سینکڑوں ڈالر اس پر خرچ کرتے ہو تو کوئی ڈھنگ کا کیمرہ خریدو اور فوٹو

گرافی کے کسی اسکول میں چند ہفتوں کی تربیت لو کہ اچھی تصویریں کھینچ سکو لیکن میں ہمیشہ انہیں ٹالتا رہا۔ مجھے ٹریننگ کورسز سے ہمیشہ کی چڑ رہی ہے میں انہیں کہا کرتا تھا کہ شمالی امریکہ میں لوگ ہر چیز کی ٹریننگ لیتے ہیں۔

تیراکی کی ٹریننگ

ٹینس کھیلنے کی ٹریننگ

کھانا پکانے کی ٹریننگ

لیکن میں نے تیراکی، کھانا پکانا اور ٹینس کھیلنا سب خود ہی سیکھا ہے۔ اگر کسی نے اولمپکس میں حصہ لینا ہو تو ٹریننگ لینا سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر ہم یہ کام اپنا دل خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور مشغلے کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں تو ٹریننگ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کوئی پروفیشنل فوٹوگرافر تو بننا نہیں تھا اس لئے فوٹوگرافی کی ٹریننگ لینے کی چنداں ضرورت محسوس نہ کی۔

Whitby آنے کے بعد میری ایک مریضہ Monica سے ملاقات ہوئی جو بہت اچھی Paintings بنایا کرتی تھی لیکن جب سے وہ نفسیاتی مسائل اور ڈیپریشن کا شکار ہوئی تھی اس نے فن کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ نفسیاتی علاج کے دوران مجھے احساس ہوا کہ باقی معالجین اس کا علاج دوائیوں سے کرتے رہے تھے کسی نے اس کی زندگی کے تخلیقی پہلو کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کہ جب تک تم دوبارہ پینٹنگ کرنا شروع نہیں کروگی تمہاری نفسیاتی صحت بہتر نہیں ہوگی۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اسے اندازہ ہوا کہ میں سنجیدہ ہوں تو کہنے لگی ''میرا نہیں خیال کہ میں اب کبھی بھی پینٹنگ کر سکوں گی'' پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولی ''ایک وہ دور تھا جب میری پینٹنگز کی نمائش ہوا کرتی تھی مجھے لوگوں کے تعریفی خطوط موصول ہوا کرتے تھے، اخباروں میں میرے بارے میں کالم لکھے جاتے تھے اور میرے اپنے طالبعلم ہوا کرتے تھے جنہیں میں پینٹنگ کا فن سکھایا کرتی تھی''

''تم دوبارہ وہ سب کچھ کرسکتی ہو''

''ڈاکٹر سہیل، فن پر زور نہیں چلتا۔ آپ تو خود ادیب ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی سے مجبوراً شاعری نہیں کروائی جاسکتی۔ اگر کوئی زبردستی نظم لکھے گا تو وہ بے جان اور پھسپھسی ہوگی''

پھر میں نے اسے ایک فنکارہ Pegge Hopper کا قصہ سنایا جس کی تصویروں سے میں Hawaii کے سفر کے دوران متعارف ہوا تھا۔ اس کی تصویروں کے مجموعے میں اس کا ایک انٹرویو بھی شامل تھا۔ جس میں اس سے پوچھا گیا تھا کہ آپ نے نیویارک اسکول آف آرٹس میں چار سال گزارے تھے آپ نے وہاں سے کیا سیکھا تھا۔ Pegge کہنے لگی کہ پہلے میں تخلیقی لمحوں کا ہفتوں انتظار کیا کرتی تھی اور جب تک مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری نہ ہو جاتی تھی میں برش نہ پکڑتی تھی لیکن اب میں ہر روز برش، رنگ اور سادہ کاغذ لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ جب سے میں نے تخلیقی لمحوں کا اس طرح انتظار کرنا شروع کیا ہے وہ جلد جلد ملنے آنے لگے ہیں۔

میں نے بھی مونیکا کو تخلیقی لمحوں کے انتظار کا مشورہ دیا اور وعدہ لیا کہ وہ ہفتے میں دو تین دفعہ اپنے برش، رنگ اور کاغذ لے کر بیٹھ جائے گی۔ پہلے چند ہفتے تو کچھ نہ ہوا لیکن جب بارش شروع ہوئی تو طوفان آگیا۔ اس نے چند مہینوں میں تقریباً درجن بھر تصویریں بناڈالیں اور بقول اس کے ''وہ پہلے سے بہتر ہیں'' بعض تصویریں تو اپنی تکمیل سے پہلے ہی بک گئیں اور ان میں سے اکثر کی قیمت تین چار سو ڈالر سے کم نہ تھی۔ اس واقعہ سے نہ صرف مریضہ کا حوصلہ بڑھا بلکہ پینٹنگ اور آرٹ میں میری دلچسپی بھی بڑھی۔ میں نے جب مونیکا سے اسکی پینٹنگ کی تفاصیل پوچھی تو کہنے لگی کہ اکثر اوقات جب وہ کسی فطرت کے منظر سے متاثر ہوتی ہے تو اسکی تصویر لے لیتی ہے اور بعد میں اس تصویر کو پینٹنگ کی صورت میں ڈھال لیتی ہے۔ اس طرح مجھ پر اس کی پینٹنگز اور فوٹوگرافی کے

رشتے کا انکشاف ہوا۔

اتفاقاً انہی دنوں میری ایک رفیق کار نے میرا تعارف Whitby کی ایک آرٹسٹ Mary Ellen سے کروایا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں اتارتی ہے اور پھر ان میں اپنی مرضی سے رنگ بھرتی ہے۔ اس طرح بعض دفعہ آدھی تصویر بلیک اینڈ وائٹ ہوتی ہے اور آدھی رنگین اور بعض دفعہ وہ رنگ بھی ایسے بھرتی ہے جو فطری رنگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے فوٹو گرافی اور پینٹنگ کا یہ امتزاج پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسکے بعد میری ملاقات میری ایلن کے بھائی Shawn سے ہوئی جو فنکار ہی نہیں، شاعر بھی تھا اور پھر میری ایلن کی سہیلی Rowena سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے بتایا کہ وہ ''رنگوں میں سوچتی ہے''۔

ان فنکاروں سے ملنے کے بعد جیسے مجھے تیسری آنکھ مل گئی اور میں درختوں، پرندوں، جانوروں اور فطرت کے دیگر مناظر کو نئے انداز سے دیکھنے لگا۔ لاشعوری طور پر میرا اپنے ماحول سے ایک رشتہ استوار ہو رہا تھا۔

اسی دوران مجھے اپنے دوست زاہد لودھی کے ساتھ سان فرانسس کو کا سفر کرتے ہوئے ایک خوبصورت Camera نظر آیا۔ جو بیک وقت Automatic بھی تھا اور جس میں Zoom Lens بھی نصب تھا ہمیں وہ کیمرہ اس قدر پسند آیا کہ ہم نے دو خرید لیے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ہفتوں تک میں ایک بچے کی طرح اسی کیمرے کے ساتھ کھیلتا اور اس سے تصویریں اتارتا رہا۔ اور پھر اسے Venezuala کے سفر میں ساتھ لے گیا۔ واپس آکر جب میں نے تصویریں دھلوائیں تو ایک غروب آفتاب، سمندر اور کشتی کی تصویر دیکھ کر اچھل پڑا۔ وہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں اتنا خوش تھا کہ دوستوں کو وہ تصویر دکھاتا پھرا۔ وہ سب اس سے بہت متاثر ہوئے۔

اسی دوران مونیکا کی پینٹنگز کی نمائش ہوئی جس میں اس نے چند پینٹنگز کی تصاویر اتار کر اور انہیں ایک مقامی فوٹوگرافر سے Laminate کروا کے پیش کیا۔ وہ طریقہ مجھے پسند آیا چنانچہ میں نے غروب آفتاب، سمندر اور کشتی والی تصویر کو بڑا کروا کے لیمینٹ کروایا جس سے اس کا رنگ اور بھی نکھر آیا۔

اس کے بعد تو وہ کیمرہ چوبیس گھنٹے میرے پاس رہتا اور میں درختوں، پودوں، برف، غروبِ آفتاب اور فطرت کے دیگر مناظر کی تصاویر لینے لگا۔ میں جس سفر پر جاتا کیمرہ ساتھ لے جاتا۔

اس طرح میں نے دو ہی سالوں میں شمالی امریکہ، یورپ اور ایشیا کے بیسیوں شہروں اور مناظر کی تصویریں اتاریں اور پھر ان میں سے چند ایک کا چناؤ کر کے جن میں وینی زویلا کی غروب آفتاب کی Barbaoos کے ایک باغ میں ایک کچھوے کے پودے کے پتے کھانے کی۔ پیرس کے ایک تالاب میں کنول کے پھولوں اور سنہری مچھلیوں کی اور Oshawa میں جھیل کے کنارے ایک پاؤں پر کھڑے Seagull کی تصویریں شامل تھیں۔ اپنے دفتر میں اور نیاگرا فال اور پانی میں نہاتے پرندوں کی تصاویر کلینک کے ویٹنگ روم کی دیوار پر لٹکا دیں۔ ان تصویروں نے کلینک کی دیواروں کو ایک نیا حسن بخشا تھا۔

اور پھر میری ملاقات Natalie سے ہوئی جس نے مجھے ان تصاویر کے بارے میں جو میرے کلینک میں ایک سال سے زیادہ مدت سے لٹکی ہوئی تھیں نئے زاویوں سے دیکھنے اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

Natalie سے میری ملاقات چند ہفتے پہلے ہوئی تھی جب اسے ہسپتال کے ایک وارڈ سے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنے کی سزا میں نکال دیا گیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے اپنے دفتر کے ایک کونے میں ایک کرسی میں دبکی ہوئی ملی وہ شکل سے چوبیس پچیس برس کی عورت نظر آ رہی تھی اس کا جسم کافی فربہ تھا۔ وہ ایک پرندے نما جانور کو اپنی آغوش میں دبائے بیٹھی تھی۔

میں نے ''ہیلو'' کہا تو اس نے مجھے غصے میں گھورا۔ لیکن جواب نہ دیا۔
میں نے اپنا تعارف کروایا تو پھر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
میں نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے پوچھا ''آپ کے پاس یہ کس قسم کا کھلونا ہے''

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ غصے میں چیخی ''میں ایک عورت Therapist چاہتی ہوں''

میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کئی نرسیں کام کرتی ہیں اور اگر اس کی خواہش کسی عورت سے علاج کرانے کی ہے تو میں اس کا انتظام کروا سکتا ہوں چنانچہ میں نے اپنی رفیق کار نرس Joan سے Appointment لے دی۔ دو ہفتے بعد جب میں جون اور نٹیلی ملے تو نٹیلی کہنے لگی ''میں سب مردوں سے نفرت کرتی ہوں لیکن تم سے سب سے زیادہ کرتی ہوں''

میں نے کہا ''تمہیں نفرت کرنے کا حق ہے لیکن مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے''

کہنے لگی ''تم نے میرے دوست کو (اس نے اپنے پرندے کی طرف اشارہ کیا) کھلونا کہا تھا یہ اس کی بھی توہین ہے اور میری بھی۔ میں نے کہا ''میرا مقصد خیریت پوچھنا تھا توہین کرنا نہیں تھا۔ میں آئندہ سے محتاط رہوں گا۔

اس کے بعد ہم نے چند منٹ باتیں کیں اور پھر وہ جون کے ساتھ چلی گئی۔

اس میٹنگ کے بعد اس نے ہر ہفتے ملنے کا وعدہ کر لیا اور وہ باقاعدگی سے ہر ہفتے آدھ گھنٹے کی Appointment کے لیے آنے لگی۔

دوسرے ہفتے بھی وہ غصے میں تھی۔ کہنے لگی میں تمہارے دفتر میں کرسی پر نہیں بیٹھوں گی، زمین پر بیٹھوں گی''

میں انتظار گاہ کے ایک صوفے سے ایک Cushion اٹھا لایا تاکہ وہ سرد فرش پر نہ بیٹھے اس نے وہ کشن قبول کر لیا۔

اس نے مجھے اگلے دو انٹرویوز میں بتایا کہ وہ انسانوں سے نفرت کرتی ہے اور پرندوں اور جانوروں سے محبت۔ وہ نہ کسی انسان کو چھوتی ہے اور نہ انہیں خود کو چھونے دیتی ہے۔

وہ عورت میرے لیے معمہ تھی۔

ایک دن کہنے لگی ''میں کبھی کبھار نظمیں لکھتی ہوں۔

میں نے کہا کہ میں انہیں پڑھنا چاہوں گا تاکہ اسے بہتر طور پر سمجھ سکوں۔

اگلے ہفتے وہ اپنی ڈائری تو لے آئی لیکن مجھے نہ دی۔ کہنے لگی میں ابھی تم پر اعتبار نہیں کرتی۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔

اس سے اگلے ہفتے کہنے لگی میں تمہیں ڈائری تو دے دوں گی لیکن میرے جانے کے بعد پڑھنا۔

جب میں نے اس کی نظمیں پڑھیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ اسے بچپن میں اس کے والد نے ذہنی اور جنسی طور پر اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ان واقعات کی تلخی نے اس کے ذہن اور شخصیت میں زہر گھول رکھا تھا۔ شاید اسی لیے وہ تمام انسانوں سے نفرت کرتی تھی۔ خاص کر مردوں سے۔ میرے دل میں اس کے لیے بہت ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں نے اگلے انٹرویو میں اسے بتایا کہ مجھے اس کی نظمیں پڑھ کر بہت دکھ اور افسوس ہوا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ نفسیاتی علاج سے ایک دن وہ صحت مند زندگی گزار سکے گی۔

اس نے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو ''سب مرد اور سب تھیراپسٹ ایک جیسے ہوتے ہیں''

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد مجھے ہر ہفتے یوں محسوس ہوتا جیسے اسکے غصے میں کمی آ رہی ہو۔

آخر ایک دن میں اپنے دفتر میں آیا تو بلیک بورڈ پر جو میں مریضوں اور

ان کے رشتہ داروں کے سوالوں کے جواب کے لیے استعمال کرتا ہوں ایک پرندے کی تصویر دیکھی اس پرندے کی شکل Natalie کے پرندے سے ملتی جلتی تھی میں سمجھ گیا کہ وہ Natalie کا تحفہ تھا۔

Natalie اگلے دن آئی تو میں نے اس کے تحفے کا شکریہ ادا کیا۔ وہ حسب دستور زمین پر کشن رکھ کر بیٹھ گئی اور بات چیت کرنے لگی۔ اس دن مجھے محسوس ہوا کہ غصے کی دیوار اتنی کم ہو گئی تھی کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

آخر میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"Natalie یوں لگتا ہے جیسے اب تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں ؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور تمہارا رویہ بھی بدل گیا ہے''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا

''آخر اس کی وجہ ؟'' میں سراپا سوال تھا

''تمہاری تصویریں'' اس نے مختصر سا جواب دیا

''تصویریں ؟ میں سمجھا نہیں''

''میں کئی ہفتوں سے دیواروں پر لگی تمہاری اتاری ہوئی تصویریں دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ اگر تم نے جھیل، پرندوں اور جانوروں کی اتنی پیار سے تصویریں اتاری ہیں تو تم اتنے برے انسان نہیں ہو سکتے''

اور وہ مسکرا دی۔ ایسی مسکراہٹ جس کا ہر ماہر نفسیات کو انتظار رہتا ہے ایسی مسکراہٹ جو صحت مند رشتوں اور منزلوں کی طرف پہلا موڑ ثابت ہوتی ہے۔

اس دن Natalie کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک دیواروں پر لگی تصویروں کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج بھی سوچ رہا ہوں۔

جنوری ۱۹۹۲ء

مسیحا
کا کرب

(ایک ماہر نفسیات کا خط)

پیارے دوست اشوک مالا!

آج شام میں بہت غمزدہ اور اداس ہوں۔ مجھے دوستوں نے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن میں نے معذرت کر دی۔ میرے دوست بہت حیران ہوئے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ میں ایسی تقریبات میں ضرور شامل ہوا کرتا ہوں بلکہ محفل کی جان بن جاتا ہوں لیکن آج شام میں اپنی اداسی کے ساتھ چند گھنٹے گزارنا چاہتا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ میں کسی سے اپنا دکھ درد بانٹوں لیکن میرے پاس کوئی ایسا ہمدرد نہیں جسے میں آج کے غم میں شریک کر سکوں اس لئے مجھے تمہاری یاد آئی۔ تم مجھ سے بہت دور لیکن میرے دل کے بہت قریب رہتے ہو۔ تم میرے رفیق کار ہی نہیں میرے دوست بھی تھے اگرچہ تم کسی اور شہر جا بسے ہو لیکن میں اب بھی تم سے ایک قلبی تعلق محسوس کرتا ہوں اور یہ وہی تعلق ہے جس کی وجہ سے میں تمہیں آج اپنے دل کا حال لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

تم سوچ رہے ہو گے کہ آخر وہ کون سی ایسی بات یا واقعہ ہے جس نے مجھے اتنا دل گرفتہ کر دیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ پچھلے مہینے جب میں چھٹیوں

سے لوٹا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری غیر موجودگی میں میرے ایک مریض نے خودکشی کرلی تھی وہ نوجوان شائیزو فرینیا کے مرض میں مبتلا تھا۔ ایک دن وہ اپنی کار میں بیٹھا، گیراج کا دروازہ بند کیا، کار چلائی، ایک بڑا Exaust System, Hose Pipe پائپ سے باندھا اور پھر کار کا دروازہ بند کرلیا۔ وہ اپنی کار میں اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک Carbon Monoxide گیس نے اسے بے ہوش نہ کردیا ۔جب اس کے خاندان کے افراد کو پتہ چلا تو وہ مر چکا تھا۔ جب مجھے اس کی موت کی خبر ملی تھی تو میں ایک دو دن کے لئے غمزدہ ہوا تھا اور پھر اپنے ہسپتال کے معمول میں کھو گیا تھا لیکن آج ہسپتال کے Clinical Records Deptt نے مجھے اس کا چارٹ دیا اور آخری نوٹس لکھنے کو کہا تاکہ اس کا چارٹ ہمیشہ کے لئے بند کیا جا سکے، تو میرے دل میں ایک دفعہ پھر ٹیس سی اٹھی۔ جب میں اس کے بارے میں نوٹس لکھ رہا تھا تو مجھے دو اور مریضوں کی یاد نے ستایا، جنہوں نے خودکشی کرلی تھی اور میں کچھ اور غمزدہ ہو گیا ان میں سے ایک حادثہ پچھلے سال واقع ہوا تھا اور ایک تقریباً چار سال پیشتر۔

جس مریض نے پچھلے سال خودکشی کی تھی وہ بھی شائزو فرینیا کا ہی مریض تھا۔ وہ ایک خوبصورت، ذہین، تخلیقی صلاحیتوں کا مالک جوان تھا۔ لیکن حد سے زیادہ حساس طبیعت کا مالک تھا چونکہ اس کے چہرے پر چند کیل اور مہاسے تھے اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ وہ نہایت بدصورت ہے۔ وہ بہت شرمیلا انسان تھا اور دوسرے لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ وہ تمام دن شہر کی گلیوں میں تنہا گھومتا رہتا۔ مختلف ڈاکٹروں نے اس کا مختلف ادویہ سے علاج کرنا چاہا لیکن اسے افاقہ نہ ہوا۔ وہ جب بھی کوئی دوائی کھاتا تو اس کے Side Effect سے بہت پریشان ہوتا۔ جب وہ میرے زیر علاج تھا تو میں بھی اس سے وہ خصوصی رشتہ نہ قائم کرسکا جو ایک معالج اور مریض کے درمیان ہوتا ہے میں جب بھی اس سے ملتا تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے اتنا دور ہو کہ میں اسے دیکھ تو سکتا ہوں سن بھی

سکتا ہوں لیکن چھو نہیں سکتا تھا۔

چند مہینوں کے علاج کے بعد بھی جب میرے علاج سے اس کی طبیعت بہتر نہ ہوئی تو میں نے اس کا ایک ہمدرد نرس سے تعارف کروایا۔ میں نے سوچا شاید وہ اس کی کچھ مدد کر سکے لیکن وہ کوشش بھی کار آمد ثابت نہ ہوئی۔ پھر ہم نے اسے ہسپتال کے اس خصوصی وارڈ میں داخل کروایا جس میں شائزوفرینیا کے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے اس وارڈ کے ماہر نفسیات نے اس کی دوائیاں بھی بدلیں لیکن اس سے بھی اسے فائدہ نہ ہوا۔

اس کا مرض دوائیوں کے علاج سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ وہ ایک روحانی کرب میں مبتلا تھا وہ ہر روز اپنی صلیب اٹھا کر چلتا تھا۔ ایسی صلیب جو اس کے لئے بہت بھاری تھی اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو بہت بے بس پاتا۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں کسی صورت کامیاب نہ ہو پاتا۔ ایک دفعہ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''تم نہیں جانتے کہ میں کس کرب میں مبتلا ہوں۔ میں ہر وقت اپنے ماضی کے ڈراؤنے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ میں اس آسیب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں لیکن ناکام رہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری مدد کرنا چاہتے ہو لیکن تم بھی میری طرح بے بس ہو۔ تمہاری نفسیات بھی میرے مرض اور درد کے آگے گھٹنے ٹیک چکی ہے'' میں کئی مہینوں تک اس کی بپتا سنتا رہا اور اسے ایک ماہی بے آب کی طرح تڑپتا دیکھتا رہا۔

ایک دن وہ ایک نظم لے کر آیا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

''میرے گھر میں''

آؤ میرے گھر میں آؤ میرا نام جہنم ہے۔

آؤ میں تمہیں اپنا کرب دوں تاکہ تم بھی مضطرب ہو جاؤ

میرے گھر میں تاریکی کے شعلوں کے اس پار

ایک گھنٹی بجتی ہے۔

میں تمہیں اپنے خوف میں شامل لانے کی دعوت دیتا ہوں
ایک وہ دور تھا جب میں رات خدا کے قرب میں جنت میں رہتا تھا۔
لیکن پھر میں نے شکست کھائی اور
خدا کے تخلیق کردہ اس جہنم جہنم زار میں آگرا
اور نفرت کا ایک عفریت بن گیا۔
میں انسان سے نفرت کرتا ہوں اور
اس کی روح پر مایوسی کا سایہ کرتا ہوں
میرا نام تباہی ہے۔
دنیا میں جتنی جنگیں اور قتل و غارت ہوئے ہیں۔
میری ہی وجہ سے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔
میں جہنم کا شیطان ہوں
خدا ایک فاختہ ہے اور میں ایک عفریت۔
عفریت نے فاختہ کے کمزور پر کچل ڈالے ہیں
میری وجہ سے کرہ ارض پر انسانی زندگی
سسکتی اور کراہتی ہے۔
میں حرص کے گیت گاتا ہوں۔
میں جنگوں میں بربادی کا بگل بجاتا ہوں۔
انسانی چیخیں سن کر خوش ہوتا ہوں۔
ایک دن میں
خدا کی انسانی مخلوق کو۔
نیست و نابود کردوں گا۔
آؤ شیطان میری روح کو سیاہ کردو۔
آؤ، میرے گھر میں آؤ یہی جہنم ہے۔

اور پھر ایک دن وہ انٹرویو کے لئے آیا تو مسکرا رہا تھا۔ اس کے سراپا سے مسرت و انبساط کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے کبھی اسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک دن مقامی کلب میں گیا تو اس کی ایک ناچنے والی Stripper سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو کلب میں ہی گفتگو کرتے رہے اور پھر وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ اس پر اتنی مہربان ہوئی کہ بوس و کنار کے بعد وہ اس کے ساتھ سو گئی۔ اس عورت نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک شریف النفس انسان ہے اور ایک اچھا عاشق ہے۔ اس شام اس نے خود اپنے آپ کو حیران کر دیا تھا۔

وہ رومانوی رشتہ چھ ہفتے قائم رہا۔ وہ چھ ہفتے اس مریض کی چوبیس سالہ زندگی کے بہترین چھ ہفتے تھے۔

اور پھر وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی اس کا دل ٹوٹ گیا۔

اس مریض نے اس عورت سے کہا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ اسے اپنے گھر بلاتا لیکن وہ نہ آتی۔ ایک دن وہ اس عورت کا پیچھا کرتا رہا۔ اس دن اسے معلوم ہوا کہ وہ شہر کے باہر ایک Trailer میں رہتی ہے۔ اگلے ہفتے وہ اس Trailer تک جا پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان باہر نکلا۔ میرے مریض نے عورت کے بارے میں استفسار کیا۔ اس مرد نے بڑے مہذب لہجے میں بتایا کہ وہ شاپنگ کرنے گئی ہے۔ میرا مریض بہت مایوس ہوا۔

اگلے چند ہفتوں میں وہ بہت غمزدہ اور اداس رہنے لگا۔ اس کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ میں نے اسے ہسپتال داخل کر دیا اور وہ ایک ماہر نفسیات سے علاج کروانے لگا۔ چند ہفتوں کے علاج کے بعد وہ ہسپتال سے چھٹی لے کر اپنے والدین کے گھر چلا گیا جو ہسپتال سے دو سو میل دور رہتے تھے۔

چند دنوں کے بعد اس کے والدین چھٹیاں منانے چلے گئے اور اسے اکیلا گھر چھوڑ گئے۔ جب وہ دو ہفتوں کے بعد لوٹے تو انہوں نے اس کی لاش پائی وہ

کب کا خودکشی کر چکا تھا۔

میں کافی عرصے تک سوچتا رہا کہ کیا اس کی خودکشی کا کوئی تعلق اس کے جنسی تجربات سے تھا اور کیا جنسی جذبات کا تشدد کے جذبات کے ساتھ کوئی گہرا رشتہ ہے؟ میں خود اس سوال کا جواب نہیں جانتا۔ اس مریض کے حادثے سے مجھے وہ فلم یاد آئی جو میں نے چند سال پیشتر دیکھی تھی۔ اس کا نام تھا Equus اس فلم میں رچرڈ برٹن ایک ماہر نفسیات کا کردار ادا کرتا ہے اور ایک نوجوان کا علاج کرتا ہے جو اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہوتا ہے اور جس نے ایک اصطبل میں چھ گھوڑوں کو ایک چاقو سے اندھا کر دیا ہوتا ہے۔ جب فلم میں کہانی کے پردے اٹھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حادثہ اس واقعہ کے بعد پیش آتا ہے جب وہ نوجوان اس اصطبل کے مالک کی بیٹی کے ساتھ جنسی لذت سے آشنا ہوتا ہے۔

میرے مریض نے میرے ذہن میں بہت سے سوالات ابھارے اور میں غمزدہ ہو گیا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس دردناک واقعہ کے بعد ہسپتال کا ایک شخص بھی میرے پاس یہ پوچھنے نہ آیا کہ تمہارے مریض نے خودکشی کر لی ہے، تمہارا کیا حال ہے۔ ہسپتال کو اس بات کی فکر تھی کہ اس کا چارٹ مکمل ہو جائے تاکہ ان پر کوئی مقدمہ نہ کر سکے۔ مجھے بعض دفعہ حیرانی ہوتی ہے کہ ہسپتال میں دوسروں کا علاج کرنے والے بعض دفعہ خود کتنی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس مریض کے حادثے نے مجھے ایک اور مریض کی یاد دلائی ہے جو بہت پریشان رہا کرتی تھی۔ وہ درجنوں بار ہسپتال میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بازو اتنی بار چاقو سے کاٹے تھے کہ ان پر زخموں کے مستقل نشان بن گئے تھے۔ اس نے جتنے بھی ڈاکٹروں، نرسوں اور سوشل ورکروں سے علاج کروایا تھا وہ سب اس سے ناامید ہو چکے تھے وہ سب اس کا علاج کرنا ''وقت کا زیاں'' سمجھتے تھے۔ میں نے جب اس کی بپتا ہمدردانہ لہجے میں سنی تھی تو وہ مجھ سے ملنے آنے لگی وہ جب بھی کسی مصیبت میں ہوتی تو Emergency Department چلی آتی۔ اگر

میں مصروف ہوتا تو وہ اس وقت تک انتظار کرتی جب تک کہ میں فارغ نہ ہو جاتا۔ اس نے کبھی مجھ سے کوئی نصیحت نہیں مانگی اور نہ ہی میں نے دی۔ میں بس اس کی کہانی سنتا اور وہ اپنے دل کا حال سنا کر چلی جاتی مجھے ہمیشہ یوں لگتا جیسے وہ زندگی سے کچے دھاگے سے بندھی ہو۔

ایک دفعہ جب میں چھٹیوں پر گیا ہوا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتی ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ چلی آئی۔ نرس نے اسے بتایا کہ میں موجود نہ تھا لیکن وہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کر سکتی تھی۔ وہ مریضہ نہ مانی اور واپس چلی گئی۔ اگلے دن اس نے خودکشی کر لی۔

اگرچہ اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے ہیں لیکن اس کا افسردہ چہرہ اور زخم خوردہ بازو آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں، جنہیں میں آنکھیں بند کر کے دیکھ سکتا ہوں۔

مجھے بعض دفعہ یوں لگتا ہے کہ ہم مریضوں کا علاج کرتے وقت اپنے چہرے پر کئی اور چہرے سجا لیتے ہیں اور ڈاکٹر، نرس، سوشل ورکر، مریض، علاج، نفسیات کی اصطلاحات کو اپنے اور مریضوں کے درمیان حائل کر لیتے ہیں اور اس طرح دو انسانوں کا مخلص اور حساس رشتہ، Professionalism کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے لیکن جب ہم غمزدہ اور اداس ہوتے ہیں اور ہمارے قلوب میں گداز پیدا ہوتا ہے اور ہماری آنکھیں تنہائی میں نم ہوتی ہیں تو ہمیں مریض مریض نہیں نظر آتے بلکہ وہ انسان بن جاتے ہیں۔

آج میرا دل اس عورت کی زندگی اور موت کا ماتم کر رہا ہے جو چند سال پہلے ہم سے جدا ہو گئی اگرچہ باقی ماہرین کے لئے وہ وقت کا زیاں تھی لیکن میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ماہرین نفسیات جتنا کچھ اپنے مریضوں سے سیکھتے ہیں اس کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کرتے۔ اس عورت نے جتنے دکھ برسوں سے سہے تھے میں ان کا دسواں حصہ، چند دن بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

میں نے ہمیشہ دل ہی دل میں اس کے صبر و تحمل اور اس کے حوصلے کی داد دی تھی۔

جب ہمارے مریض ہم سے رخصت ہو جاتے ہیں تب ہمیں ان کی یاد آتی ہے۔ میرے خیال میں انسان کے لئے اپنی کمزوریوں کے اعتراف کے لئے بھی حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اور کمزور لمحوں میں ہمیں اپنے دوستوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا دوست ملا ہے جسے میں اپنے دکھ درد میں شریک کر سکتا ہوں۔

تمہارا مخلص دوست

خالد سہیل

۱۹۹۳ء

تعبیریں
بتانے
والی

وہ ساری عمر اپنے آپ کو مسیحا سمجھتی رہی لیکن......

اس نے برسوں انسانی ذات کے تہ خانوں میں چھپے رازوں کو جاننے کی کوشش کی اور جب اس نے بصیرتوں کے اتنے خزانے دریافت کر لیے کہ دوسروں میں بانٹ سکے تو ایک دن اس نے اپنی زندگی کو دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

وہ ہر روز ہسپتال جاتی اور صبح سے شام تک دکھی لوگوں کی کہانیاں سنتی، ان کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتی اور ان کے تاریک دلوں میں امید کی شمعیں روشن کرتی۔

وہ غمزدہ لوگوں کو بتاتی کہ وہ زندگی کے جنگل میں بھٹک رہے ہیں اور چاروں طرف انجانی منزلوں کی طرف جاتی ہوئی بیسیوں پگڈنڈیوں میں ایک پگڈنڈی ایسی بھی ہے جو ان کی زندگی کی شاہراہ سے جا ملتی ہے لیکن اس پگڈنڈی کی تلاش ایک مشکل مرحلہ ہے۔

وہ دکھی لوگوں کو سمجھاتی کہ ظاہر کی آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے لوگوں

نے باطن کی آنکھیں بند کر لی ہیں، خارج کی دنیا میں مسائل کا حل تلاش کرتے کرتے وہ اپنے داخل کی دنیا سے بے خبر ہو گئے ہیں اور مشینوں کے شور میں روح کی موسیقی دب گئی ہے۔

وہ مسرت اور سکون کے متلاشیوں کو مشورہ دیتی کہ وہ اپنی مصروف زندگی میں خاموشی، تنہائی اور یکسوئی کے لمحے تلاش کریں تاکہ وہ اپنی روح کی سرگوشیاں سن سکیں اور اپنے خوابوں پر غور کر سکیں کیونکہ وہی سرگوشیاں اور وہی خواب ان پگڈنڈیوں کے راز لے کر آتے ہیں جن کے رشتے شاہراہوں سے جا ملتے ہیں۔

وہ برسوں سچائی کی زندگی گزارتی رہی اور لوگوں کے معاشی، معاشرتی، خاندانی اور جذباتی مسائل میں ان کی مدد کرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو جنسی ناآسودگی کا شکار ہیں۔

ایک شخص آکر کہتا کہ وہ پینتیس برس کا ہو گیا ہے لیکن اس نے آج تک کسی عورت کو برہنہ نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا کہ عورت کے لمس میں کیا سحر پوشیدہ ہے۔ وہ اکثر راتوں کو خواب میں کسی دوشیزہ کی آنکھوں، ہونٹوں اور بدن کو چھوتا ہے، محسوس کرتا ہے بغلگیر ہوتا ہے اور اسکے شباب کے خمار میں کھو جاتا ہے لیکن صبح اسکی تنہائی اور تشنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے اس طرح برسوں سے اس کی زندگی میں محرومی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔

دوسرا شخص آکر بتاتا کہ وہ ایک ایسے رشتہ ازدواج میں برسوں سے بندھا ہوا ہے جو اپنی ساری تازگی اور رومانس کھو چکا ہے۔ اس کا رشتہ اسے ایسے گنّے اور مالٹے کی یاد دلاتا ہے جس سے سارا رس چوس لیا گیا ہو۔ وہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے اگر کبھی کبھار، ہمبستری کرتا بھی ہے تو کسی اور عورت کا تصور لے کر کیونکہ اسے یقین ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو نامردی کا شکار

ہو جائے۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا کیونکہ اس نے اس سے عمر بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اس کے پاس ایک ایسا شخص بھی آتا جو اسے بتاتا کہ برسوں کی بے محبت کی شادی سے اکتا کر اس نے ایک اور عورت سے راہ و رسم بڑھا لیے ہیں۔ اس کی محبوبہ کو اس کی بیوی کا پتہ ہے۔ لیکن اس کی بیوی کو محبوبہ کی خبر نہیں۔ وہ ہمیشہ ایک تضاد میں الجھا رہتا ہے۔ ایک طرف تو وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بیوفائی کر رہا ہے لیکن دوسری طرف جانتا ہے کہ اس کی محبوبہ نے اس کی شادی کو سہارا دے رکھا ہے اگر اس کی محبوبہ نہ ہوتی تو اس کی کب کی طلاق ہو چکی ہوتی۔ وہ اپنی محبوبہ سے جو خوشیاں حاصل کرتا ہے ان میں وقتاً فوقتاً اپنی بیوی کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہی تضاد کانٹا بن کر اس کی روح میں چبھتا رہتا ہے اور اسے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔

اس کی ایک اور شخص سے بھی ملاقات ہوئی جس نے سب روایتی رشتوں کو خیر باد کہہ دیا تھا وہ ایک آزاد زندگی گزارتا تھا وہ ایک عورت کے ساتھ سہ پہر کی چائے پیتا، دوسری عورت کے ساتھ شام کا کھانا کھاتا اور تیسری عورت کے ساتھ صبح کا ناشتہ کرتا۔ اگرچہ اس کی زندگی رومانس اور خوشیوں سے بھری ہوئی تھی لیکن پھر بھی اسے سکون دل حاصل نہ تھا۔ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی ذات کی سب کھڑکیاں اور دروازے بند ملتے وہ اپنے من کی اس شمع کو جلانا چاہتا تھا جو کب کی بجھ چکی تھی۔

وہ ان سب لوگوں کی اور نجانے کتنے اور لوگوں کی کہانیاں اور خواب سنتی۔ ایسے خواب جنہیں وہ اپنے نہ کسی رشتہ دار، دوست یا محبوب کو سنا سکتے اور دل کا حال سنانے سے ہی ان کی روحوں سے آدھا بوجھ اتر جاتا۔ وہ بھی خوش تھی کہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کر رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو اپنے دور کا مسیحا سمجھتی۔

جو لوگ اس سے مشورے مانگتے وہ انہیں بتاتی کہ زندگی ایک سمندر ہے اور انسانی دل ایک کشتی۔ جب تک کشتی سمندر کی سطح پر تیرتی رہتی ہے، محفوظ رہتی ہے اسے لاکھوں ٹن پانی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا لیکن جب کشتی شکستہ ہو جائے اور اس میں دراڑیں پڑنے لگیں اور پانی اندر آنے لگے تو کشتی کے اندر آیا ہوا تھوڑا سا پانی، اس بہت سے پانی سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو کشتی کے باہر ہوتا ہے کیونکہ وہ تھوڑا سا پانی ہی کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ وہ لوگوں کو بتاتی کہ جب انسان اپنے اندر کی آنکھ اور موسیقی کھو بیٹھتا ہے تو اس کے دل میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں اور انسان کا تحفظ اور خوشیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔

وہ لوگوں کو خوابوں کی تعبیریں اتنی خوبصورتی اور خلوص سے بتاتی کہ وہ اسے ماہر نفسیات کہنے کی بجائے تعبیریں بتانے والی کے نام سے یاد کرتے۔

یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینے میں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔ خوابوں کو سننے، سمجھنے اور ان کی تعبیریں بتانے کا یہ سلسلہ شاید عمر بھر جاری رہتا لیکن اسے احساس ہوا کہ اس کے جذبے اور خلوص کی شدت میں کمی آ رہی ہے۔ وہ اپنے سے پوچھنے لگی کہ کیا اس کے اپنے من کو دیمک لگ رہی ہے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی اپنی اندر کی آنکھ غنودگی کا شکار ہو رہی ہو۔ وہ کچھ عرصے تو اپنے آپ سے لڑتی رہی لیکن پھر اس نے گھٹنے ٹیک دیے جب اس کی آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہوئیں تو خوابوں کے دروازے کھل گئے۔ وہ کیا دیکھتی ہے کہ وہ اپنے عہد سے ایک صدی پہلے پہنچ گئی ہے وہ ایسے دور میں پہنچ گئی ہے جب اکثر انسان دیہاتوں میں رہتے تھے اور کبھی کبھار شہروں میں آتے تھے۔

وہ لوگ جو اپنی رومانوی زندگی سے ناخوش تھے وہ شہر جا کر کسی طوائف کے دروازے پر دستک دیتے اور اپنے ناآسودہ جذبات کی تسکین چاہتے لیکن جب گاؤں لوٹ کر آتے تو احساس گناہ میں مبتلا ہو جاتے۔ اپنے احساس کی شدت میں

کمی کرنے کے لئے وہ پادری کے پاس جاتے۔ وہ ان سے ان کے گناہوں کی پوری کہانی سنتا اور انہیں بار بار آکر گناہوں کے اعتراف کی تلقین کرتا۔ ایسا کرنے سے ان کی روح کا بوجھ ہلکا ہوتا اور وہ سبک سبک اپنی زندگی گزارتے رہتے۔

وہ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ آخر ایک دن وہ پادری شہر کو جاتا ہے اور اتفاقاً اس کی ملاقات اس طوائف سے ہو جاتی ہے جس کے پاس اس کے گاؤں کے لوگ جایا کرتے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس طوائف کو جنم جنم سے جانتا ہے۔ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں پوری شام ایک دوسرے کی تنہائیوں سے بغلگیر ہوتے رہتے ہیں اور پھر خوابگاہ کا رخ کرتے ہیں۔ اس کا خواب اس لمحے ایک عجیب رخ اختیار کرتا ہے۔ جب صبح دم خوابگاہ سے نہ تو پادری نمودار ہوتا ہے نہ ہی طوائف لیکن جب وہ اس کی خوابگاہ میں داخل ہوتی ہے تو اپنے آپ کو اس بستر میں سویا ہوا پاتی ہے۔ وہ بستر بالکل اس کے اپنے بستر کی طرح تھا اور وہ خوابگاہ بالکل اس کی اپنی خوابگاہ کی طرح۔

اس دن کے بعد وہ کبھی ہسپتال نہ گئی بلکہ شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ جو لوگ اسے اپنی بپتا سنانے آتے تھے وہ کہنے لگے کہ شاید وہ خود اپنے کسی خواب کی تعبیر تلاش کرنے چلی گئی ہے وہ خواب جو اس کے لئے اس پگڈنڈی کی نشاندہی کرے گا جس پر چلتے چلتے وہ اپنی شاہراہ تلاش کر لے گی۔

ستمبر ۱۹۹۳ء

اپنے ملک
میں
مہاجر

جب میں نے تصویر مکمل کرلی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ تصویر ایک ایسے بوڑھے کی تھی جو کرسمس ڈنر کی میز پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اگرچہ اس کے چاروں طرف رنگین روشنیاں، سجا سجایا درخت، مسکراتی موم بتیاں، Turkey اور شراب کی بوتل مسرت وانبساط کے پیغامبر تھے لیکن میز کی دوسری طرف خالی کرسی اداسی کی علامت بن گئی تھی۔ تصویر بناتے ہوئے مجھے بالکل اندازہ نہ ہوا تھا کہ میں کینوس پر اپنی ذات کا ہی Portrait بنا رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک دن میں کرسمس ڈنر اکیلا کھا رہا ہوں گا۔ چالیس سال کی رفاقت کے بعد میری بیوی مجھے داغ مفارقت دے کر دار فانی سے کوچ کر جائے گی اور میرے بچے مجھ سے منہ موڑ لیں گے۔ کوئی بھی شخص بھلا کس طرح اپنے خاندان کے بغیر کرسمس منا سکتا ہے؟ میں تو ایسی روایات کے سائے میں پلا بڑھا تھا جہاں کرسمس کے موقع پر بچے، والدین، رشتہ دار اور سب خاندان والے مل کر کھانا کھاتے تھے، جشن مناتے تھے اور ایک دوسرے کو تحفے دیتے تھے۔

میری زندگی میرے لیے ایک خواب بن گئی تھی ایک سوگوار خواب،

میری بیوی کی موت، بیٹے کی ایک یہودی عورت سے شادی اور بیٹی کے ایک دہریے ہندوستانی مرد کے ساتھ شادی کے بغیر زندگی گزارنے کے فیصلے سے، میں اپنے خاندان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

میرے بچے نہ تو مجھے فون کرتے تھے اور نہ ہی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ ہماری آخری ملاقات اس کرسمس کے موقع پر ہوئی تھی جب میں نے درخت سجایا تھا، شاندار کھانا تیار کیا تھا، خاص قسم کی شراب اور قیمتی تحفے خریدے تھے اور اپنے بچوں اور ان کے شرکاءِ حیات کو چھ بجے شام کی دعوت دی تھی۔ میں نے چھ بجے میز تیار کر دی تھی اور آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد میز پر موم بتیاں بھی جلادی تھیں اور ٹرکی بھی رکھ دیا تھا۔ مہمانوں کا انتظار کرتے ہوئے میں نے شراب پینی شروع کر دی تھی۔ جب وہ آٹھ بجے آئے تو اس وقت میں شراب کے نشے اور غصے سے کانپ رہا تھا۔ انہوں نے ٹریفک کا بہانہ بنایا لیکن میں ایسے ذلیل بہانے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے غصے میں چلانا شروع کر دیا تھا اور انہیں چیخ چیخ کر بتایا تھا کہ انہوں نے اپنی ماں کی وفات کے بعد مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ نہ تو وہ فون کرتے ہیں نہ مجھے اپنے گھر بلاتے ہیں اور کرسمس کے موقعہ پر بھی اپنے احساس گناہ کو کم کرنے اور تحفے لینے چلے آتے ہیں۔ میں نے انہیں کھانا کھلائے اور تحفے دیے بغیر ہی چلے جانے کو کہا۔ انہوں نے معافی مانگنی چاہی تو میں نے انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

اگلی صبح جب مجھے ہوش آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے مہمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کر چکا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں غصے اور شراب کے نشے میں ایسی باتیں کہہ گیا تھا جو حقیقت پر مبنی نہ تھیں لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا ہر لفظ سچائی پر مبنی تھا۔ شراب نے صرف مجھے وہ حوصلہ بخشا تھا کہ میں اس سچائی کا کھلم کھلا اظہار کر سکوں۔

چنانچہ میں نے اپنے بچوں کو نہ تو فون کیا اور نہ ہی ان سے معافی مانگی۔ اس واقعہ کے بعد میں اپنے آپ کو اپنے گھر اور اپنے شہر میں اور بھی تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ شہر جہاں میں نے اپنی ساری زندگی گزاری تھی۔ وہ شہر جہاں میرا بچپن گزرا تھا لیکن بد قسمتی سے میرے بچپن کے دوست یا تو مر چکے تھے یا دور دراز کے شہروں اور ملکوں میں جا بسے تھے اور میرے پاس نہ تو ان کا فون نمبر تھا اور نہ ہی پتہ۔ اس بھری دنیا میں میرا ایک بھی قریبی دوست نہ تھا میرے برش کے علاوہ، وہ برش جس کے ذریعے میں اپنی روح کی ساری تلخیاں، محرومیاں اور اداسیاں کینوس پر بکھیر دیتا تھا اور پھر ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتا تھا اور پھر ایک دن جب میرے بیٹے نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ میرے ساتھ سب تعلقات منقطع کر رہا ہے اور چونکہ میں نے اس کی بیوی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لئے وہ مجھے قبول نہیں کر سکتا تو میں اتنا سوگوار ہوا تھا کہ میں ایک لمبی سیر کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس دن پہلی دفعہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا ''ایسی بے معنی زندگی سے مر جانا بہتر'' اور میں لاشعوری طور پر جھیل کی طرف چل پڑا تھا۔ چونکہ موسم بہت سرد تھا اس لئے میں پندرہ بیس منٹ پیدل چلنے کے بعد شہر کی لائبریری میں رک گیا تھا۔ میرا ارادہ تو تھا کہ جوں ہی میرے نحیف و سرد جسم کو گرمی اور توانائی کا احساس ہو گا میں دوبارہ انجانی منزل کی طرف چل پڑوں گا لیکن مجھے لائبریری کے نوٹس بورڈ پر یہ نوٹس نظر آیا۔ آج شام ایک ایشیائی ادیب اور ماہر نفسیات ڈاکٹر سہیل تقریر کریں گے۔ انکی گفتگو کا موضوع ہے: ہم سب دو خاندانوں کے مالک ہیں'' تو میں نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ شام میری اداس زندگی کا خوشگوار موڑ ثابت ہو گی۔ اس کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کے دو خاندان ہیں۔ ایک خاندان جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں اور ایک خاندان جو ہم اپنے لیے خود بناتے ہیں۔ پہلا خاندان ہمارے رشتہ داروں کا ہوتا ہے اور دوسرا

خاندان ہمارے دوستوں اور محبوبوں کا۔ میں اس تقریر سے اتنا متاثر ہوا کہ میں تقریر کے بعد سہیل سے ذاتی طور پر ملنے گیا وہ بہت دلچسپ آدمی تھا۔

جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک فنکار ہوں تو اس نے میری پینٹنگز میں دلچسپی لی اور انہیں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی ایک ادیب ہے اور شاعری اور افسانے تخلیق کرتا ہے اس ملاقات کے بعد ہم کئی دفعہ ملے اور آہستہ آہستہ دوستی کے ناطے میں منسلک ہو گئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے کسی ایسے شخص سے دوستی کی تھی جو نہ تو مغرب کا پلا بڑھا تھا اور نہ ہی عیسائی تھا۔ میں جب بھی سہیل سے ملتا۔ وہ مجھے دلچسپ لوگوں کی کہانیاں سناتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے والدین ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک چاہتے تھے لیکن بعد میں کئی دفعہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگیں ہوئی تھیں۔ سہیل کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اس نے ایک جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کے لئے خندقیں کھودی تھیں اور ایک گاؤں کو بموں سے تباہ ہوتے دیکھا تھا کیونکہ اس گاؤں کے ایک دیہاتی نے دشمنوں کے بمبار طیارے کو اپنی بندوق سے مار گرانے کی کوشش کی تھی۔ سہیل کا ایمان تھا کہ دنیا میں مذاہب لوگوں کو ملانے آئے تھے جدا کرنے نہیں اور عوام ہمیشہ سیاسی اور مذہبی پارٹیوں کے رہنماؤں کی ہوس کی بھینٹ چڑھتے رہے تھے اس کا خیال تھا کہ ملکوں کی حکومتوں سے زیادہ وہ عوام اہم تھے جو ہر تبدیلی کے لئے قربانیاں دیتے رہے تھے۔ میں جب بھی سہیل سے ملنے جاتا تو زندگی کا کوئی ایسا موضوع زیر بحث آتا جس پر میں نے پہلے کبھی سنجیدگی سے غور نہ کیا ہوتا۔

ایک شام سہیل نے مجھے اپنے گھر بلایا تاکہ میں اس کے ایک عزیز دوست دانش سے مل سکوں۔ دانش کا تعلق ہندوستان کے ایک مسلمان گھرانے سے تھا۔

’’تو آپ دونوں رقیب ممالک سے تعلق رکھتے ہیں‘‘ میں مسکرایا۔

’’لیکن اب ہم دوست بن چکے ہیں‘‘ دانش نے یہ کہہ کر سہیل کو گلے سے لگالیا۔ میں دو ایشیائی مردوں کے درمیان ایسی بے تکلفی دیکھ کر بہت خوش ہوا جو شمالی امریکہ کے مردوں کے درمیان بہت کم نظر آتی ہے۔

دانش بھی میری Paintings کے بارے میں متجسس تھا۔ اس نے میری تصاویر کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے بتایا کہ وہ ایک تنہا بوڑھے آدمی کی پینٹنگز ہیں۔ دانش نے مجھے بتایا کہ وہ کلکتے کی گلیوں میں پلا بڑھا تھا اور Street Theatre میں شرکت کی وجہ سے بائیں بازو کے فنکاروں کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ اس کے کئی دوستوں کو حکومت پر تنقید کرنے کی وجہ سے کئی راتیں جیل میں گزارنی پڑی تھیں مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ دانش ہندی، بنگالی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میں انگریزی کے علاوہ سپانوی، جرمن، فرانسیسی اور کنیڈا کے قبائل کی کسی ایک زبان سے واقف ہوتا تو میری زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ دانش اور سہیل سے ملاقات کے بعد میں دوسرے ممالک کی زبانوں، ثقافتوں، روایات اور طرزِ زندگی میں دلچسپی لینے لگا تھا اگرچہ میں کبھی اپنے ملک سے باہر نہ گیا تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ملک کے ایک شہری کو اچھی طرح جاننے سے میرا ایک ثقافت سے تعارف ہو سکتا ہے۔

سہیل اور دانش سے ملاقات کے چند مہینوں کے بعد ایک شام یونیورسٹی کے کیفی ٹیریا میں میری ملاقات نورا سے ہوئی جو ارجنٹینا کی رہنے والی تھی۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ کنیڈا میں ایک رفیوجی کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی کیونکہ ارجنٹینا میں اس کی زندگی خطرے میں تھی تو مجھے بالکل یقین نہ آیا کیونکہ میرا کبھی کسی ایسے شخص سے واسطہ ہی نہ پڑا تھا جس کی زندگی خطرے میں ہو۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور اس کا بھائی ملک میں جابرانہ نظام ختم کرنے میں

بہت فعال تھے۔ حکومت نے انہیں پکڑ کر جیل میں ڈال دیا تھا اس کا بھائی تو قتل کر دیا گیا تھا اور وہ ملک چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ کنیڈا میں وہ، ہسپانوی ادب پڑھاتی تھی اور اپنی پی ایچ ڈی کے لئے فنکاروں میں تخلیقی صلاحیتوں اور پاگل پن کے رشتے پر تحقیق کر رہی تھی۔

نورا کی شخصیت میں میرے لیے جو بات سب سے زیادہ حیران کن تھی وہ اس کی مذہب سے لا تعلقی تھی وہ کبھی بھی مذہب، خدا یا موت کے بعد زندگی کے بارے میں گفتگو نہ کرتی تھی وہ تمام مسائل جن پر میں نے ایک Irish Catholic ہونے کے ناطے راتیں کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری تھیں۔ اس کے لئے مسئلے ہی نہ تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسکے دونوں والدین دہریے اور انٹلکچول تھے اور انہوں نے گھر میں کبھی خدا اور مذہب کے بارے میں بحث مباحثہ نہ کیا تھا۔

ایک دن جب میں مقامی لائبریری میں داستان گوئی کی محفل میں گیا تو میری ملاقات انجلا سے ہوئی جس کا تعلق Trinidad سے تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی اور اس کی آواز میں عجب سوز تھا۔ وہ ایک مذہبی لیکن بالغ نظر عورت تھی اور اپنے نظریات کسی پر تھوپنے کی قائل نہ تھی۔ وہ بہت جذباتی انسان تھی۔ اس نے ایک دن مجھے بتایا تھا کہ Carribbean Islands کے لوگ یورپ اور شمالی امریکہ کے لوگوں کے مقابلے میں بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ اس نے میری توجہ کالوں کی موسیقی کی طرف مبذول کروائی اور بتایا کہ اس میں گوروں کی موسیقی کی نسبت جذبات کا شدت سے اظہار ہوتا ہے۔ اس موسیقی نے بغاوت کی کئی تحریکوں کو جنم دیا تھا۔ انجلا سے دوستی کے دوران آہستہ آہستہ میری اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوئی کہ کریبین جزیروں میں بہت سے مذاہب اور زبانوں کے لوگ بستے تھے۔

جوں جوں میرے دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا میری تنہا شاموں میں کمی آتی گئی اور میرے ذہن کے دریچے کھلنے لگے۔

اگلے دو سالوں میں میری چند اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ہیری تھا جو کمیونزم کے دور میں یوگوسلاویہ کے کھیتوں پر کئی سال کام کر چکا تھا اور پھر ایک دن فرار ہو کر کینیڈا چلا آیا تھا۔ انہی دنوں میری ملاقات ایتھوپیا کی ایک عورت مریم سے بھی ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا دادا مسلمان تھا جو افریقہ کے مختلف ممالک میں سیر و سیاحت اور کاروبار کے لئے جایا کرتا تھا اور ہر ملک میں اس کے مقامی عورتوں سے مراسم ہوا کرتے تھے۔ اس کے گیارہ ممالک میں گیارہ بچے تھے۔ مریم کی دادی کیتھولک تھی۔ کیونکہ جب وہ چار سال کی تھی تو اس کے سب رشتہ دار قحط کا لقمہ بن کر ہلاک ہو گئے تھے اور وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ میلوں چل کر ایک گرجے میں پہنچی تھی جہاں کے پادری نے ان دونوں بچوں کو اپنے سایہ عافیت میں لے لیا تھا اور بڑی محبت سے انہیں پالا پوسا تھا اور اس طرح وہ دونوں کیتھولک بن گئے تھے۔

اس عرصے میں میری ملاقات شبیر سے بھی ہوئی جس کا تعلق جنوبی افریقہ سے تھا۔ وہ بھی ایک ماہر نفسیات تھا لیکن بہت شریر انسان تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسے ماحول میں پلا بڑھا تھا جہاں وہ انڈین سمجھا جاتا تھا اور اسے گوروں، کلرڈ یا کالوں سے ملنے جلنے کی بالکل اجازت نہ تھی چونکہ اس کی ایک سفید فام گرل فرینڈ تھی اس لئے پولیس ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔

میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ کسی معاشرے میں پولس لوگوں کی رومانوی زندگی پر بھی نگاہ رکھتی ہوگی۔

آخر کرسمس کے موقع پر میں نے ان تمام دوستوں کو ڈنر پر بلایا اور جب وہ سب میز پر بیٹھ گئے تو میں نے ان کی خدمت میں ایک Painting پیش کی، جس میں وہ سب میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں اور ٹرکی اور شراب کی بوتل پڑے ہوئے تھے، وہ پینٹنگ شوخ رنگوں میں بنائی گئی تھی جس سے ماحول کے پر انبساط موڈ کا اندازہ ہوتا تھا لیکن اس تصویر کے

پس منظر میں کچھ سائے بھی نظر آرہے تھے اور ان سایوں میں کچھ اداس چہرے بھی تھے اور وہ اداس چہرے ان لوگوں کے تھے جو میری طرح وقت کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کے افراد کھو چکے تھے اور اپنے گھر میں اجنبی بن گئے تھے۔ مجھے وہ تصویر دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ میں بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا جن کے گرد دوسرے ملکوں کے لوگ آ گئے تھے اور وہ اپنے ملک میں ہی مہاجر بن گئے تھے۔ اس تصویر کے چہرے اب بھی کبھی کبھار میرے خوابوں میں آکر مجھے اداس کر جاتے تھے۔

اس ڈنر کے بعد میں نے سوچا تھا کہ کیوں نہ میں اپنے بچوں اور ان کے شرکاء حیات کو قبول کر لوں اور انہیں خلوص دل سے دعوت دوں۔ میں کافی عرصے تک سوچتا رہا کہ اپنے جیسے کئی اور لوگوں کی طرح میں انہیں پہلے کیوں نہ قبول کر سکا تھا۔

عین ممکن تھا کہ میرے بچے مجھ سے چند قدم آگے تھے۔

نومبر ۱۹۹۲ء

ترپ
کا
اکّا

میرے محبوب ساحل!

میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں کہوں آؤ! میرے پہلو میں لیٹ جاؤ۔ میرے بازو پر اپنا سر رکھو، میرے رخساروں اور ہونٹوں کو بوسے دو، مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ، میرے سراپا کو اپنے بازوؤں میں لے لو کیونکہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ خود سپردگی کے اس موڑ پر پہنچی ہوں جہاں میں اپنی ذات کاملۃً تمہیں پیش کر سکتی ہوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ آج سے پہلے میں جب بھی تمہارے ساتھ سوئی تھی تو میرا جسم تو تمہارے ساتھ ہوتا تھا لیکن میرا ذہن کسی اور کے خوابوں میں الجھا رہتا تھا اور میری روح کسی اور کے تصورات سے سرگوشیاں کر رہی ہوتی تھی۔ شاید اسی لئے میں تمہیں اس شدت سے نہ چاہ سکتی تھی جس کے تم حقدار تھے اور تمہارا دل ٹوٹ گیا تھا جس کا تمہیں حق تھا کیونکہ تم نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ میں نے تمہاری چاہت کی قدر نہ کی کیونکہ میں خود فریبیوں کے ایسے گرداب میں کھوئی ہوئی تھی جس سے تم واقف نہ تھے اگر تم میرے ماضی سے واقف ہوتے تو عین ممکن تھا کہ تم مجھے بہتر سمجھ سکتے۔

کیا تم ایک مشرقی عورت کا کرب سمجھتے ہو ؟ کیا تم ایک ایشیائی عورت کا دکھ جانتے ہو ؟ کیا تم ایسی عورت کی جنگ سے واقف ہو، جو روایات کی اتنی اونچی دیواروں میں پلی بڑھی ہو کہ نسلوں سے کسی نے باہر نہ دیکھا ہو۔ بچپن سے جوانی تک میرے والدین اور رشتہ دار ہر موڑ پر میری آزادی کو خاندان کی جھوٹی عزت پر قربان کرتے رہے اور میرے پر کاٹتے رہے۔ میرے خاندان میں میری نانی وہ واحد ہستی تھیں جو میرا ساتھ دیتیں اور میری جنگ لڑتیں۔ وہی مجھے اپنے والدین سے ہمسایوں کے بچوں کے ساتھ پکنک پر جانے یا اسکول میں تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کی اجازت دلواتیں اور جب میرے والدین نے مجھے یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے داخلے سے اس لئے منع کر دیا کہ وہاں Co-Education ہے اور ان کی مشرقی حیا کو گوارا نہیں کہ میں مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کروں تو میری نانی اماں نے انہیں قائل کیا تھا کہ آج کے دور میں لڑکیوں کے لئے تعلیم بہت ضروری ہے اسی سے نہ صرف ان کا شعور بڑھتا ہے بلکہ وہ اپنے بچوں کی بھی تعلیم کا بہتر انتظام کر سکتی ہیں تو میرے والدین بادل ناخواستہ تیار ہو گئے تھے۔

میں نے ایم اے تو کر لیا لیکن مجھ پر اتنی پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ آخر مجھے اس مشرقی ماحول سے فرار ہونے کا واحد طریقہ یہ نظر آیا کہ میں کسی ایسے صاحب ثروت سے شادی کا پیغام قبول کر لوں جو مغرب میں بسا ہو چنانچہ میں پاکستان سے ہجرت کر کے کنیڈا چلی آئی تھی۔

لیکن ٹورانٹو میں پہلی رات ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جو شخص مجھے اپنی بیوی بنا کر لایا تھا وہ انسانی جذبوں کے گداز سے ناواقف تھا۔ وہ پھولوں کی خوشبو، جھرنوں کی موسیقی اور انسانی خوابوں کی آہٹ سے نابلد تھا۔ اس نے پہلی رات ہی جب میرے سراپا کو ایسے ٹٹولا اور جھنجھوڑا جیسے میں اس کی ملکیت ہوں تو میری روح کو اتنے کچوکے لگے کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ

نکلے۔ وہ میرے آنسوؤں سے بے خبر میرے جسم پر اپنے بوسوں سے نیل ڈالتا رہا اور میں اپنے جسم کو ایسے دیکھتی رہی جیسے وہ کسی اور کا جسم ہو۔

جب اس کے سرد سینے پر میرا ایک گرم آنسو گرا تو وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

خیریت؟

میں نہ تو کوئی Rubber Doll ہوں اور نہ ہی ایک رات کی خریدی ہوئی عورت۔

لیکن تم میری بیوی تو ہو۔

بیوی ہوں لیکن ابھی نہ تو تمہاری دوست بنی ہوں اور نہ ہی محبوبہ۔

اس کو جیسے ایک ذہنی دھکا لگا ہو وہ مجھ سے ایسی گفتگو کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے

کاش تم چند دن انتظار کر لیتے۔ ابھی تو میرا Jet Lag بھی ختم نہیں ہوا۔

اور وہ عالم بے بسی میں میرے پہلو میں لیٹ گیا تھا۔ اس کے سارے اعضاء مضمحل ہو گئے تھے اور اعصاب شل۔ اس پر شاید زندگی میں پہلی مرتبہ نامردی کا حملہ ہوا تھا۔

جبار! مجھے تمہارے لمس سے اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہاری زندگی کی پہلی عورت نہیں ہوں لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم میری زندگی کے پہلے مرد ہو اور شاید اسی لئے تم نے مجھ سے شادی کی ہے۔

وہ تو اس رات پہلو بدل کر سو گیا تھا اور میں رات بھر اپنے تکیے کے غلاف سے آنسو خشک کرتی رہی تھی۔

جبار کے ساتھ میری شادی کے چند سال مجبور رفاقت کے چند سال تھے۔

جب ہم دونوں اکیلے ہوتے تو اکثر خاموشی سے ٹی۔وی دیکھتے رہتے

جیسے ہماری روحوں پر کوئی بھاری بوجھ ہو لیکن جب مہمان آتے تو ایسے شیر و شکر ہوتے کہ دوسروں کو ہم پر رشک آتا۔

آپ جیسا محبت کرنے والا جوڑا ہم نے بہت کم دیکھا ہے۔ آپ ایک Ideal Couple ہیں۔

مجھے کسی کو اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھانے کی عادت نہ تھی اس لئے میرے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ پھیل جاتی اور جبار بھی مصلحتاً خاموش رہتا۔

شروع شروع میں تو مجھے امید تھی کہ شاید جبار کا رویہ بدل جائے گا اور وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرے گا لیکن آہستہ آہستہ وہ امید راکھ میں ملتی گئی اور میں اپنے ازدواجی رشتے سے ناامید ہوتی گئی۔

اگر بات صرف رومانوی رشتے کی ناکامی کی ہوتی تو شاید اتنی بڑی Trag-edy نہ ہوتی۔ مجھے دھیرے دھیرے احساس ہوا کہ جبار نے کبھی عورت کا احترام کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں عورت ذات جنسی تسکین کے ذریعے سے زیادہ کچھ وقعت نہ رکھتی تھی۔ وہ شاید بازار سے دودھ خریدتے تنگ آچکا تھا اس لئے گائے خرید لایا تھا۔ وہ کبھی کبھار شیخی بگھارنے پر آتا تو اپنے ماضی کے رومانوی قصے ایسے سناتا جیسے کوئی فوجی اپنے جنگی کارناموں کی کہانیاں سناتا ہے۔ اس نے کبھی کسی عورت سے دوستی نہ کی تھی۔

مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کے لئے میری آرزوئیں، خواہشیں، امنگیں اور خواب کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس کے ذہن میں بیوی کا ایک خاکہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میں اس سانچے میں ڈھل جاؤں۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس سے غیر ضروری طور پر نہ الجھوں لیکن میں اس سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے خود ہی چیخ کر رہ گئی۔

جبار نے مجھے سر کے بال لمبے رکھنے کو کہا تو میں نے سر کے بال کٹوانے چھوڑ دیے۔ جب اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ سر کے بال کیوں کٹواتی ہوں تو میں

نے اسے بتایا کہ جب میں یونیورسٹی میں تھی تو پڑھائی میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ بالوں کی نگہداشت کا وقت نہ ملتا تھا۔ میں نے جب اس سے پوچھا تھا کہ وہ مجھ سے بال بڑھانے کی فرمائش کیوں کر رہا تھا تو کہنے لگا کہ جب سے وہ کینیڈا آیا تھا اس کی Fantasy Life برباد ہو گئی تھی۔ پاکستان میں وہ لمبے بالوں اور بھوری آنکھوں والی عورتوں کے تصورات میں کھویا رہتا تھا لیکن کینیڈا میں اس نے جتنی عورتوں کو بھی ڈیٹ کیا تھا وہ سب چھوٹے بالوں والی Blonde اور Brunette تھیں۔ میں ایسی باتیں سن کر ہنس دی تھی۔ میں ایشیائی مردوں کے اس المیے سے پہلے واقف نہ تھی۔

بالوں کے بعد اس کی فرمائش کپڑوں میں تبدیلی ہو گئی تھی اس کی خواہش تھی، جو درخواست کم اور حکم زیادہ محسوس ہوتی تھی کہ میں شلوار قمیض کے ساتھ ساتھ پتلونیں، ٹی شرٹیں اور Jeans بھی پہنا کروں۔ اسے خوش کرنے کے لئے میں نے وہ بھی پہننے شروع کر دیے۔

کپڑوں کے بعد کھانوں کی باری آئی۔ خود تو اس نے نہ تو کبھی انڈا بنایا تھا نہ ہی چائے۔ ایک جنوبی افریقہ کی عورت فاطمہ ہر ہفتے عشرے کے بعد پانچ سات کھانے بنا کر دے جاتی تھی جسے وہ Freeze کر لیتا اور گرم کر کر کے کھاتا رہتا لیکن مجھ سے یہ فرمائش تھی کہ میں Italian, Greek Chinese, اور Mexican کھانے پکانے سیکھوں تا کہ جب وہ اپنے دوستوں کو بلائے تو فخر سے کہہ سکے کہ میری بیوی طرح طرح کے کھانے پکانا جانتی ہے۔ میں نے وہ سب کچھ بھی کیا۔ کھانے میں بناتی اور Credit وہ لیتے۔

کچھ عرصے کے بعد جب کچھ بے تکلفی بڑھی اور مجھ میں دل کی باتیں کہنے کی ہمت ہوئی تو میں نے ایک شام کہا۔ ”جبار ذرا ٹی وی بند کرو اور میری بات سنو“

”کیا بات ہے؟“ اس نے لاتعلقی سے پوچھا

"پہلے ٹی وی بند کرو تب بتاؤں گی بات اہم ہے" جب اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ تو میں نے کہا۔

"دیکھو جبار! تم ڈاکٹر ہو۔ صبح ہسپتال چلے جاتے ہو اور شام کو تھکے ہارے لوٹتے ہو پھر خبریں سن کر اور کھیلوں کا پروگرام دیکھ کر سو جاتے ہو۔ میں ساری رات چار دیواروں کو گھورتی رہتی ہوں اور دن بھر احساس تنہائی کے زخم چاٹتی رہتی ہوں۔

تو آخر چاہتی کیا ہو؟" اس کے لہجے میں ہمدردی کی بجائے بیزاری کا رنگ غالب تھا۔

"میں نے بھی پاکستان میں اردو ادب میں ایم اے کیا تھا۔ کیوں نہ میں یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں اور ایسی تعلیم حاصل کروں جس سے یہاں ملازمت کرنے کے قابل ہو سکوں"

"پاگل ہوئی ہو" اس نے طنزیہ قہقہہ لگایا" ادب میں ایم اے کی بات کرتی ہو۔ یہاں تیسری دنیا کے سینکڑوں ڈاکٹر ایسے ہیں جو ہسپتالوں میں اردلیوں کا کام کرتے ہیں۔ کتنے انجینئر ہیں جو ٹیکسیاں چلاتے ہیں اور کتنے وکیل ہیں، جو Parking Lots میں چھ ڈالر فی گھنٹہ کی ملازمت کرتے ہیں۔ تم تو رانیوں کی طرح رہتی ہو۔ تمہیں تو مفت میں امگریشن مل گیا ہے۔ یہاں نجانے کتنے لوگ ہیں جو سالہا سال سے امگریشن کے لئے گل سڑ رہے ہیں۔ ویسے، تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔'

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری زمینیں بھی ہیں، جائدادیں بھی۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو تم اتنی دیر سے گھر کیوں آتے ہو پریکٹس کم کرو اور شامیں میرے ساتھ گزارا کرو۔ میں نے تمہارے ساتھ "شادی کی ہے ان چار دیواروں کے ساتھ نہیں۔

میری کتنی خواہش ہے کہ ہم

اکٹھے پارک میں سیر کرنے جائیں
شاپنگ سنٹر میں خریداری کریں
فلمیں اور ڈرامے دیکھیں
کتاب خانوں میں نئی اور پرانی کتابوں کا جائزہ لیں
اور کبھی مل جل کر کھانا پکائیں اور Candle Light Dinner سے محظوظ ہوں۔

لیکن تم کسی اور ہی نگر کے باسی لگتے ہو اور ہم دو دوستوں یا محبوبوں کی طرح نہیں دو Room Mates کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔''

اس گفتگو کے بعد اس نے گھر تو جلد آنا نہ شروع کیا لیکن ان دوستوں اور ان کی بیویوں کو جن کو وہ کبھی کبھار بلایا کرتا تھا اکثر بلانے لگا۔ اس کے دوستوں میں نہ تو کوئی ادیب تھا، نہ فنکار، نہ فلاسفر، وہ یا تو ڈاکٹر تھے یا وکیل، یا بزنس مین تھے یا اکاؤنٹنٹ اور ان سب کے اعصاب پر ڈالر سوار تھے۔ وہ سب غریب خاندان کے مہاجر نو دولیتے تھے جو انسانوں کو ان کے بینک بیلنس کے ترازو میں تولتے تھے۔

میں ان مہمانوں اور ان کی بیویوں کو اپنا نام سفینہ بتاتی لیکن وہ مجھے مسز خٹک ہی کہہ کر بلاتے۔ وہ تمام عورتیں جو اپنے خاوندوں کے ساتھ آتیں ہمیشہ مسز فاروقی، مسز صدیقی، مسز چودھری اور مسز ملک ہی کہلاتیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے نام سے تعارف نہ کرواتی۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ سب ایسی چڑیاں ہیں جو خوبصورت پنجروں میں بند ہیں اور ایک دن وہیں سونے کی چوری کھاتے کھاتے مر جائیں گی۔ وہ سب مجھے اپنے خاوندوں کی Extension لگتیں۔ میری حالت ان سے مختلف نہ تھی لیکن میں جانتی تھی کہ میں قید میں ہوں۔ وہ تو اپنی غلامی پر فخر کرتیں۔ پہلے تو مجھے ان کی منافقت پر غصہ آتا لیکن آہستہ آہستہ مجھے ان پر رحم آنے لگا۔ مجھے لگا کہ انہیں نفرت کی نہیں ہمدردی کی

ضرورت ہے۔

دلچسپی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سب مرد شراب پیتے تھے لیکن عورتیں کوکا کولا اور اورنج جوس کی فرمائش کرتیں۔ جبار نے مجھے اپنے دوستوں کے لئے Drinks تیار کرنے سکھادئے تھے۔ جن اینڈ ٹانک، رام اینڈ کوک، بلڈی میزر۔ اور نجانے کیا کیا۔ میں بھی یہ سب کچھ سیکھ رہی تھی کیونکہ میں ایک اچھی طالب علم تھی اور جانتی تھی کہ ایک ادیبہ اور فنکارہ کیلئے زندگی کی درسگاہ میں سیکھا ہوا کوئی درس ضائع نہیں جاتا۔ کہیں نہ کہیں کام آہی جاتا ہے۔

جبار کے تمام دوستوں اور ان کی بیویوں میں مجھے صرف ایک عورت ایسی ملی تھی جسے جان کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا نام امید تھا اور اس نے ایک فرنچ کینیڈین سے شادی کی ہوئی تھی وہ خود ایک سوشل ورکر تھی اور اس کا خاوند Computers کا ماہر تھا اور جبار کے Computers کا خیال رکھتا تھا۔ امید جب ایک پارٹی میں شریک ہوئی اور ہمارے مہمانوں کی بیویوں سے ملی تو مجھ سے بے تکلفی سے کہنے لگی کہ یہ تم کن Robots میں پھنس گئی ہو۔ ان کی قربت تو تمہاری روح کو دیمک کی طرح کھاجائے گی۔ ایک دفعہ جب جبار کسی کانفرنس کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا تو وہ مجھے ایک Weekend کے لئے اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اسے اپنے حالات سے مختصراً تعارف کروایا۔ تو کہنے لگی کہ اگر تم نے اس ملک میں رہنا ہے تو دو کام کرو۔ ڈرائیونگ سیکھو اور بینک میں اپنا علیحدہ اکاؤنٹ کھلواؤ تاکہ اگر تمہاری شادی کا بھرم کسی دن چکنا چور ہو تو تم اپنے پاؤں پر کچھ دن کھڑی رہنے کے قابل ہو سکو۔ میں نے امید کے مشوروں پر عمل کیا۔ اور جبار کی ناراضگی مول لے کر ڈرائیونگ سیکھی اور اسے مجبور کیا کہ اپنی جیسی Jaguar تو نہیں ایک چھوٹی اور سستی Honda ہی خرید وادے۔ میں نے اس سے چھپ کر بینک اکاؤنٹ بھی کھلوا لیا اور میں اس میں ہر ہفتے کچھ ڈالر جمع کروادیتی۔

جب میری جرأت رندانہ میں قدرے اضافہ ہوا تو ایک دن میں نے جبار کو بتایا کہ مجھے شاعری سے بہت شغف ہے۔ میں خود بھی شعر کہتی ہوں اور پاکستان اور ہندوستان کے کئی موقر رسالوں میں چھپ بھی چکی ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے، تو وہ کہنے لگا: شاعری بالکل فضول چیز ہے۔ وقت کا زیاں ہے۔ مغرب نے شاعری کو بالکل رد کر دیا ہے۔ اب یہاں کے ادیب شعر کہنے کی بجائے ناول اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ یہ فلموں، ٹی وی اور Videos کا دور ہے۔ شاعروں کا نہیں'' میں اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔ میں ادب کی ایسی بے ادبی نہ سننا چاہتی تھی۔ یہ شادی کا ڈھونگ نجانے کب تک چلتا رہتا کہ جبار کے ایک دوست نے حالات کو مزید بگاڑ دیا۔ ایک دن جبار اپنے ایک رفیق کار فیصل کو گھر لے کر آیا۔ جبار فیصل کے ساتھ مل کر ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ خریدنا چاہتا تھا۔ مجھے فیصل بالکل اچھا نہ لگا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا لیکن اپنے معاشقوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتا تھا۔ میں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جبار سے دبے الفاظ میں کہا کہ مجھے اس کی حرکتیں بالکل پسند نہیں آئیں اور وہ قابل اعتبار انسان نہیں لگتا لیکن جبار نے میری باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔

اس شام جبار نے اپنے ایک دوست کی Birthday پارٹی کا انتظام کیا تھا اور بہت سے دوستوں کو بلایا تھا۔ سب مہمان Living Room میں بیٹھے تھے کہ میں کسی کام سے باورچی خانے گئی۔ میں وہاں اپنے گلاس میں اورنج رس ڈال رہی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے فیصل کھڑا نظر آیا۔

'سفینہ کیا حال ہے؟' اس کی سانس کی بو اور آواز کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

''کیا تم مجھ سے خفا ہو؟'' میں نے اسے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں میں

ہمیشہ کی طرح عیاری کے سائے لہرا رہے تھے۔

''نہیں'' میں نے مختصر سا جواب دیا

''تو پھر اتنی بے رخی کیوں؟''

میں پھر بھی خاموش رہی

پھر اس نے اپنا بازو میری کمر میں ڈالا

''سفینہ! تم بہت خوبصورت ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں بوسہ دوں

''نہیں شکریہ''

''گالوں پر نہیں، ہونٹوں پر نہیں، بائیں پستان کے نیچے جہاں تمہارا خوبصورت تل ہے''۔

میرے سراپا میں بجلی دوڑ گئی اور میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ جاکر فرج سے ٹکرایا، لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

خبیث کہیں کا، میں بڑبڑائی اور باورچی خانے سے باہر نکل آئی

جب مہمان چلے گئے تو میں نے جبار سے کہا۔

''تم بہت بے غیرت ہو''

''کیوں کیا ہوا''

''تم غیروں کو ہماری ذاتی باتیں بتاتے ہو''

''کیسی ذاتی باتیں''

''کہ میرے بائیں پستان کے نیچے تل ہے۔ اگر میں بھی بتانے لگوں کہ تم نامرد ہو تو تمہیں کیسا لگے گا۔''

''میں نے نہیں بتایا'' وہ غرایا

''تو پھر انہیں کیسے پتہ چلا۔ میں آج کے بعد اپنے گھر میں فیصل کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر تمہارے ضمیر میں رتی بھر غیرت بھی ہے تو اس سے تمام رشتے منقطع کر دو اگر وہ دوبارہ اس گھر میں آیا تو میں اس گھر میں

نہیں رہوں گی۔

''تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ مذاق کر رہا ہو''

''میں ایسے مذاق برداشت نہیں کر سکتی''

میرے منہ میں کڑواہٹ پھیلنے لگی۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا کہ جبار نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔

اس رات میں پہلی دفعہ صوفے پر جا کر سوئی۔ جبار نے مجھے خوابگاہ میں بلایا لیکن میں نہ گئی۔

چند دن فضا میں تشنج رہا۔ نہ میں نے صلح کی اور نہ ہی جبار نے معافی مانگی۔ جب جبار نے فیصل سے تعلقات منقطع نہ کیے اور کاروبار میں کوئی فرق نہ آیا تو مجھے احساس ہو گیا کہ جبار کی زندگی میں میری کتنی اہمیت ہے۔ ایک رات جب جبار کا فون آیا کہ وہ ایک دفعہ پھر فیصل کو لے کر گھر آ رہا ہے تو میرے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا میں نے دو بیگ تیار کیے ایک میں کپڑے اور دوسرے میں اپنی کتابیں، تصویریں، کیسٹ اور زیور رکھے۔ میں نے ایک کاغذ کی پرچی پر جبار کے لئے پیغام چھوڑا:

''جبار! جس گھر میں میری عزت محفوظ نہ ہو۔ اس گھر میں رہنا میری غیرت کو گوارا نہیں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارے گھر اور تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

سفینہ

اس رات گھر سے نکلتے وقت جب میرا ایک پاؤں گھر کے اندر تھا اور ایک باہر تو مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میں ایک جنم کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی اور دوسرے جنم کو شروع کر رہی تھی۔

میں ساری رات برفباری میں شہر ٹورانٹو کی گلیوں اور سڑکوں پر بے مقصد Drive کرتی رہی۔ آخر صبح کے چار بجے مجھے امید کا خیال آیا اور میں ایک

گھنٹے کے سفر کے بعد اس کے گھر پہنچی۔ میں نے امید کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میری آنکھوں کے آنسوؤں اور سرخی سے سمجھ گئی کہ میں کس بحران کا شکار تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا اور اپنے Guest Room کا دروازہ کھولا۔ میں نے وہاں اپنے بیگ رکھے اور بستر پر دھڑام سے گر گئی۔ میں اگلے دن سہ پہر تک سوتی رہی۔ میں نے امید کو اپنی بپتا سنائی تو اس نے ایک ہمدرد دوست کی طرح اپنا دامن پھیلا دیا اور اپنے ہاں کچھ عرصے رہنے کی دعوت دی۔ میں بھی مجبور تھی، ٹھہر گئی۔

اس رات کے بعد میرا دوسرا جنم شروع ہوا۔ میں نے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کیے۔ کچھ عرصے ایک ڈرگ سٹور میں اور کچھ عرصہ ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور میں کام کیا اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں ادب اور جرنلزم پڑھنے لگی اور ہوسٹل میں رہنے لگی۔ یونیورسٹی کی آزاد فضا نے مجھے پر لگا دیے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے سانولے مشرقی رنگ کو دیکھ کر مغرب کے مردوں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ میں ایک آزاد پنچھی کی طرح ایک بستر سے دوسرے بستر پر Land کرتی رہی اور مختلف رنگ اور نسل کے ہونٹوں سے اپنی نسلوں کی پیاس بجھاتی رہی۔

میں لذتوں کے سمندر میں کود گئی تھی اور ایسے گرداب تک آ پہنچی تھی جہاں
عشق اور ہوس
خواہش اور ضرورت
اور خواب اور حقیقت کی تمیز مٹ گئی تھی۔ میں کبھی Straight مردوں کے ساتھ سوتی، کبھی Gay مردوں کو چھیڑتی اور کبھی Lesbians کے جسموں کو ٹٹولتی۔ کبھی میں اخباروں اور رسالوں میں اشتہار دیتی اور کبھی Blind Dates سے رومانوی بصیرتیں حاصل کرتی۔

میں اس مغربی دنیا کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی تھی۔ مجھے یہ

جان کر حیرانی ہوئی کہ شمالی امریکہ میں بھی جہاں مردوں اور عورتوں کو برابری کا مان تھا۔ Double Standard بدستور قائم تھے۔ وہ مرد جو ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث تھے۔ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور Stud کہلاتے اور جو عورتیں ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہوتیں، بے حرمتی کی نگاہ سے دیکھی جاتیں اور Slut کہلاتیں۔ میں ان فروعی مسائل سے بے نیاز تھی۔ میرے اندر تو ایک آتش فشاں چھپا ہوا تھا، جو پھٹ پڑا تھا۔ یونیورسٹی میں میری جو مشرقی سہیلیاں تھیں، وہ مجھے شتر بے مہار کہتیں اور جو مغربی سہیلیاں تھیں وہ کہتیں۔ You are Burning Candle From Both Ends (تم موم بتی دونوں طرف سے جلا رہی ہو) ان دنوں میں نے جی بھر کر Donna Summer اور Madonna کے گانے سنے،

Erica Jong کے ناول، Anais Nin کی ڈائری Virginia Woolf کے افسانے اور کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور عشرت آفریں کی نظمیں پڑھیں۔

ان تجربوں کا ایک فائدہ تو ہوا کہ میری شاعری جو شادی شدہ زندگی میں گھٹن کا شکار ہو رہی تھی، تازہ دم ہو گئی اور میں اپنے ہر تجربے اور بحران کے بعد نئی نظم لکھنے لگی۔ فن کا وہ دیوتا جس کی میں مہینوں منتظر رہتی، اب ہر رات ملنے آتا اور میری بیاض اس کے تحفوں سے بھرنے لگی۔ اس سفر کے دوران کئی دفعہ جبار کا خیال آیا بھی اور جی بھی چاہا کہ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ جانوں لیکن پھر یہ خود ہی اندازہ ہو گیا کہ میں جس دشت میں سفر کر رہی تھی اس دشت میں پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں آگے ہی بڑھتی گئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس خود آگہی یا خود فریبی کے سفر میں پہلی دفعہ مجھے اس شام یہ احساس ہوا کہ میں اس راستے پر بہت دور نکل گئی ہوں۔ جب ایک محفل میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کے ساتھ میں نے کئی راتیں گزاری تھیں لیکن جس کا نام بہت سے ناموں میں خلط ملط ہو گیا تھا۔ میں نے اس

واقعہ کو نظر انداز کر دیا اور اپنا بے منزل کا سفر جاری رکھا۔

اور پھر ساحل! جب میری تم سے ملاقات ہوئی تو میں ایسی دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں میرے لیے اپنوں اور غیروں کی پہچان مشکل ہو گئی تھی۔ میرے لیے سب مرد بھیڑیے تھے اور میں ان کی انا میں خنجر گھونپ کر فرحت محسوس کرتی تھی۔ مجھے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ میرے اندر برسوں کی تنہائیوں اور محرومیوں نے اتنا غصہ، نفرت اور تلخیاں بھر دی ہیں۔

اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ سب مرد ایک طرح کے نہ تھے۔ تم بخوبی واقف تھے کہ

خلوص کیا ہے

محبت کیا ہے

اعتماد کیا ہے

اعتبار کیا ہے

لیکن میں اپنی ذاتی آزادی کے نشے میں اتنی مخمور تھی کہ عشق اور ہوس اور دوستی اور وقت گزاری میں تمیز نہ کر سکی تھی۔ اور ایک شام جب تم میرے گھر آئے تھے اور مجھے کسی اور مرد کے پہلو میں سوتے پایا تھا اور تم سیخ پا ہو گئے تھے تو میں نے اپنے نئے عاشق کو رخصت کرنے کی بجائے تمہیں بغیر اطلاع دیے آنے پر برا بھلا کہا تھا اور گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔

اور اگلے دن جب تم نے ایک محبوب کی طرح مجھ سے صفائی چاہی تھی تو میں ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی تھی ''ہماری جنسی زندگی کوئی Joint Bank Account نہیں ہے کہ ہر دفعہ کچھ خرچ کرنے سے پہلے میں تم سے دستخط کراؤں''

''میرا خیال تھا کہ ہم دو وفادار انسان ہیں''

''کس سے وفادار؟''

''ایک دوسرے سے''

''یا اپنے آپ سے''

''کیا مطلب ؟''

''ہم دوسروں سے اس وقت تک وفادار نہیں ہو سکتے جب تک ہم اپنی ذات سے وفادار نہ ہوں''

''یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے''

''تم جس وفاداری کو محبت کی معراج سمجھتے ہو میں اسے دور جاہلیت کی فرسودہ روایت سمجھتی ہوں''

اور تم غصے میں رخصت ہو گئے تھے۔

اس واقعہ کو کئی مہینے بیت گئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی انا کے زخم چاٹتے رہے۔

اسی دوران میری نانی اماں بہت بیمار ہو گئیں اور مجھے پاکستان جانا پڑا۔ میری نانی اماں ایک جہاندیدہ عورت ہیں۔ ان کی دانائی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ ایک سہ پہر جب میں ان کا سر دبا رہی تھی اور وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں تو میں نے انہیں ساری کہانی سنا دی۔ انہوں نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں کھولیں۔ پھر میرا ہاتھ اپنے جھریوں بھرے ہاتھ میں لیا اور کہنے لگیں :

''بیٹا! میں نے ساری عمر تمہاری طرفداری کی ہے اور تمہاری آزادی اور خود مختاری کو سراہا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ تم نے ابھی تک رشتوں کا احترام نہیں سیکھا۔ وہ انسان سب سے زیادہ خوش قسمت ہوتا ہے جس کا محبوب اس کا دوست بھی ہو۔ تم جبار کا بدلہ ساحل سے کیوں لے رہی ہو۔ انسان کو اپنی زندگی میں ترپ کا ایک ہی اکا ملتا ہے۔ جو اسے وقت پر استعمال نہیں کرتے تو وہ اسے ہاتھوں میں پکڑے رہ جاتے ہیں اور کھیل ختم ہو جاتا ہے''

ساحل! میں نے تمہیں سمجھنے میں دیر کر دی۔ آؤ مجھے گلے لگا لو۔ آؤ ہم

ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

تمہاری سفینہ

سفینہ ! مجھے تمہاری نانی اماں سے پورا اتفاق ہے کہ ہمیں ترپ کا اکا کھیل ختم ہونے سے پہلے استعمال کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے تمہاری زندگی میں محبت کا کھیل ابھی ختم نہ ہوا ہو لیکن میری نگاہ میں ہمارے رشتے کا کھیل اس شام ختم ہو گیا تھا جس شام میں نے تمہیں کسی اور مرد کی آغوش میں دیکھا تھا اور تم نے مجھے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔

میں تمہارے لیے اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اپنی غیرت نہیں کیونکہ اس کے بعد اگر میں تمہیں چاہتا بھی تو وہ ایک بے غیرت کا پیار ہوتا۔

مجھے آہستہ آہستہ یہ بھی احساس ہو گیا ہے کہ تم بنیادی طور پر ایک شاعرہ اور فنکارہ ہو۔

تمہارا ہر نیا رشتہ، تمہاری شاعری اور ہر نیا بحران، فن کے لیے خام مال مہیا کرتا ہے۔ میں تمہاری شاعری کا قدردان ہوں لیکن تمہارے فن کے لیے خام مال بننے کے لیے تیار نہیں۔

کیوں نہ ہم اسی موڑ پر جدا ہو جائیں اور اپنے اپنے راستوں پر چلتے رہیں۔
ہم نے جتنا بھی وقت اکٹھے گزارا ہے وہ میری یادوں کا سرمایہ رہے گا۔

مخلص

ساحل

مارچ ۱۹۹۳ء

خوش قسمت

ایک جھیل میں ایک مچھلی، ایک کچھوے اور ایک بطخ کی آپس میں دوستی ہو گئی۔ ایک شام وہ تینوں بہت غمزدہ تھے۔ چنانچہ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

مچھلی کچھوے سے کہنے لگی ''تم مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو''

''وہ کس طرح؟'' کچھوے نے حیرانی سے پوچھا

مچھلی کہنے لگی ''میں پانی میں پیدا ہوئی اور پانی میں ہی مرجاؤں گی۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں زمین کے راز جانوں اور تمہاری طرح باغوں کی سیر کرسکوں''

کچھوا پہلے تو مسکرایا پھر بولا ''میرا خیال ہے کہ بطخ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے''

''وہ کس طرح؟'' بطخ نے حیرانی سے پوچھا۔

کچھوا کہنے لگا ''میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں فضاؤں کے راز جان سکوں اور تمہاری طرح ہواؤں میں اڑسکوں''

بطخ پہلے تو مسکرائی پھر بولی ''میرا خیال ہے کہ مچھلی مجھ سے زیادہ خوش

قسمت ہے''

''وہ کس طرح'' مچھلی نے حیرانی سے پوچھا۔

بطخ کہنے لگی ''میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں پانیوں کی گہرائی میں اتر سکوں اور تمہاری طرح ان کے راز جان سکوں۔ میں صرف پانی کی سطح پر تیر سکتی ہوں''

یہ سننا تھا کہ مچھلی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس گفتگو کے بعد تینوں دوست خوشی خوشی اپنے گھر چلے گئے اس شام سے پہلے انہوں نے کبھی اپنی خوش قسمتی پر غور نہیں کیا تھا۔

دو
پیروں
والی
ماں

مجھے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے جب

جنگل میں ہر روز سیر کو جانا

پرندوں کی چہکار سننا

راتوں کو چاندنی میں گھومنا پھرنا

صبح سویرے شبنم بھری گھاس پر چلنا

تالابوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہانا

اور

اپنی ماں کا دودھ پینا

میرا معمول ہوا کرتا تھا

لیکن پھر ایک دن مجھے کچھ ایسے جانور نظر آئے جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ دبلے پتلے ہی نہ تھے۔ وہ دو پیروں پر بھی چلتے تھے اور وہ لمبی نالیوں والی چیزیں بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ پہلے تو میں نے انھیں کوئی اہمیت نہ دی لیکن مجھے جلد اندازہ ہو گیا کہ میرے چاروں طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی

ہے اور پھر ان نالیوں سے آگ کے شعلے نکلے اور بہت سی مائیں تڑپنے لگیں ان میں میری ماں بھی تھی۔ میں کئی دنوں تک اداس رہا اور اپنی ماں کی لاش پر آنسو بہاتا رہا۔ نہ میرا کچھ کھانے پینے کو جی چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کو۔

چند دنوں کے بعد چند اور دو پیروں والے جانور آئے۔ پہلے تو میں ان سے گھبرایا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں لمبی نالیوں والی چیزیں نہیں تھیں۔ میں وہاں سے بھاگنے لگا تو انہوں نے گھیر لیا اور بڑے پیار سے مجھے جنگل سے اپنے گاؤں لے گئے۔

گاؤں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ وہاں اور بھی بہت سے دو پیروں والے جانور تھے اور وہ میرے ان دوستوں کو بھی جنگل سے لے آئے تھے۔ جن کی مائیں شعلوں کا نشانہ بن کر مر گئی تھیں۔ ان دو پیروں والے جانوروں میں سے ایک نے مجھے دودھ پلانا چاہا۔ وہ میری ماں بننا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے اپنی ماں بہت یاد آرہی تھی اس لئے میں نے دودھ نہ پیا۔ میری نئی ماں مجھ سے بہت پیار سے پیش آتی اور دن میں دو تین دفعہ دودھ پیش کرتی۔ آخر تیسرے دن میں نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس گاؤں میں میرا دل لگ گیا اور میں اپنے دو پیروں والے اور چار پیروں والے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ میری دو پیروں والی ماں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی اور شام سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے دودھ پلاتی اور مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ ہر شام میں اس کا شدت سے انتظار کرتا۔

جب میں ذرا بڑا ہوا تو کبھی کبھار میری دو پیروں والی ماں اور اس کے دو پیروں والے بچے، مجھے اپنے ساتھ کھیتوں میں لے جاتے۔ اگرچہ کھیت جنگل کی طرح تو نہیں تھے لیکن پھر بھی وہاں چرند پرند ضرور تھے جن سے جنگل کا سا ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔

جب میں ذرا اور جوان ہوا تو میری دو پیروں والی ماں مجھے جنگل کی طرف سیر کے لیے لے جاتی۔

ایک دفعہ میں بیمار ہوا تو میری ماں مجھے ہسپتال لے گئی۔ جہاں میرا علاج کیا گیا اور میں چند دن میں صحت یاب ہو گیا۔ آخر جب میں جوان ہو گیا تو ایک دن میری دو پیروں والی ماں مجھے جنگل میں چھوڑ آئی۔

اب میں چند سالوں سے اسی جنگل میں زندگی گزار رہا ہوں۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا، اور میرا بچپن کا معمول جس میں

جنگل میں ہر روز سیر کو جانا

پرندوں کی چہکار سننا

راتوں کو چاندنی میں گھومنا پھرنا

صبح سویرے شبنم بھری گھاس پر چلنا

اور

تالابوں میں نہانا شامل ہے، لوٹ آیا ہے۔

اب جب کہ میں جوان ہو گیا ہوں اور حالات کو بہتر سمجھ سکتا ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری ماں کو اس لئے قتل کیا گیا تھا تاکہ اس کے دانت کسی کے ڈرائنگ روم میں سج سکیں۔

اگرچہ میں جنگل کی زندگی سے بہت خوش ہوں لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے مجھے اپنی دو پیروں والی ماں بہت یاد آتی ہے۔

نومبر ۱۹۹۲ء

امن
کی دیوی

(خلیج کی جنگ کے پس منظر میں)

جولائی ۱۹۹۰ء

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ
اس کے رخساروں کی سرخی
اس کی آنکھوں کی چمک
اور
اس کے سراپا کی خود سپردگی
سب اچھے شگون تھے
وہ کہنے لگی
آؤ ہم اس چاندنی رات میں رقص کریں
اور جشن منائیں

آؤ ہم جشن منائیں کہ
جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا کو رہا کر دیا گیا ہے
آؤ ہم جشن منائیں کہ
یورپ میں برلن کی دیوار گرا دی گئی ہے
آؤ ہم جشن منائیں کہ
امریکہ اور روس نے سرد جنگ ختم کر دی ہے
آؤ ہم جشن منائیں کہ
جنوبی امریکہ میں تیزابی بارش کے خلاف
احتجاج کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔
آؤ ہم جشن منائیں کہ
اقوام متحدہ نے
بچوں کا سال منانے کا فیصلہ کیا ہے
اور ہم دونوں اس چاندنی رات میں
دیر تک رقص کرتے رہے
ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولتے رہے
ایک دوسرے کی آنکھوں میں رفاقتوں کے جام پیتے رہے
آخر جب ہم
تھکن سے نڈھال ہو کر
ایک درخت کے پہلو میں
سبز گھاس پر لیٹے
تو میں نے کہا
تم کتنی سادہ و معصوم ہو

جس دن آدم اور حوا نے
زمین پر قدم رکھا تھا
اسی دن انہوں نے
جنت الفردوس کے امن اور سکون کو خیرباد کہہ دیا تھا
جس دن ہابیل و قابیل دست و گریباں ہوئے تھے
اسی دن
انسان کی سنگدلی کا آغاز ہوا تھا
جس دن
انسان نے اسلحہ و بارود کے کارخانے لگائے تھے
اسی دن
اس نے میدان جنگ کی تلاش شروع کر دی تھی۔
جس دن
حکومتوں نے فوجی بھرتی کرنے شروع کیے تھے
اسی دن
انہوں نے دشمن بنانے بھی شروع کر دیے تھے
انسان
صدیوں سے
اپنے ماحول سے
دوسرے انسانوں سے
اور اپنی ذات سے

جنگ لڑتا آیا ہے
اور صدیوں تک لڑتا رہے گا
اس نے میری باتوں کو نظر انداز کر دیا
اور
میرے بازو پر سر رکھ کر سو گئی
جب ہم جاگے تو
چاند بادلوں کی آغوش میں
سو چکا تھا
لیکن
ہمارے انگ انگ میں میٹھا میٹھا درد
بیدار ہو رہا تھا۔

اگست ۱۹۹۰ء

اس کی آنکھوں کی تھکن
اس کے چہرے کی افسردگی
اور
اس کے سراپا کا بوجھل پن
اچھے شگون نہ تھے
وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہی
جیسے
کسی کا سوگ منا رہی ہو
وہ کئی ہفتوں سے
نہ ڈھنگ سے کھانا کھا سکتی تھی
نہ آرام سے سو سکتی تھی
مشرقِ وسطیٰ کا بحران
اس کی روح میں کانٹا بن کر چبھ رہا تھا
کہنے لگی
کسی ملک کے باشندوں کی آزادی چھین لینا
ان کے جھنڈے کو پاؤں تلے روند ڈالنا
کسی شہر کے باسیوں کو بے گھر کر دینا
اور
کسی گاؤں کے رہنے والوں
کے پاؤں میں
بیڑیاں ڈال دینا

بہت بڑا پاپ ہے
میں نے کہا
یہ تو کوئی نئی بات نہیں
تاریخ نے ہمیشہ ہمیں یہ بتایا ہے کہ
بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے
دولت ہمیشہ آنکھوں کو خیرہ
اور
دماغ کو ماؤف کر دیتی ہے
طاقت کا نشہ ہمیشہ
اس زور سے چنگھاڑتا ہے کہ
مظلوم کی آہ دب کر رہ جاتی ہے
اس گفتگو کے بعد
ہم دونوں
کافی دیر خاموش بیٹھے رہے
اور
ہمارے چاروں طرف
درختوں سے گرتے ہوئے سوکھے پتے
جمع ہوتے رہے
اس شام جب
آسمان پر
چاند طلوع ہو رہا تھا
تو ہمارے دل
ڈوب رہے تھے

جنوری ۱۹۹۱ء

میں کافی دیر تک
اس کے بستر کے قریب کھڑا رہا
وہ آنکھیں بند کیے
اپنے ماحول سے بے خبر
سو رہی تھی
اس کے چہرے کی زردی
اس کی نقاہت کی آئینہ دار تھی
نرس کہنے لگی
وہ کئی دنوں سے
موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے
ہم اسے کئی دفعہ
آکسیجن دے چکے ہیں
گلوکوز لگا چکے ہیں
ہماری باتیں سن کر وہ جاگی
اس کی آنکھیں
وحشت زدہ تھیں
کہنے لگی
کیا تم جانتے ہو
سمندر میں اتنا تیل بہایا گیا کہ
ان گنت مچھلیاں اور آبی جانور مر گئے ہیں
فضاؤں میں اتنا بارود اچھالا گیا ہے کہ

بے حساب پرندے گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں
چالیس دنوں سے
اتنے نوجوان قتل کیے گئے ہیں کہ
ریگستان میں خون کی ندیاں بہہ گئی ہیں
بے نام لاشوں کے پہاڑ بن گئے ہیں
اور
لاتعداد بچے یتیم
اور
عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں
کیا ہم نہیں جانتے کہ
ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے
مجھے ان لوگوں کے
قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں
جو اس قتل انبوہ کو
اپنی فتح سمجھ کر
جشن منا رہے ہیں
اور نیپام بم کی تباہی پر
فخر کر رہے ہیں
میں نے اس کا ہاتھ
اپنے ہاتھوں میں لیا
اس کو ڈھارس دی
لیکن دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ
جب سے

انسان اور انسانیت کا رشتہ ٹوٹا ہے

اور وہ

ہم اور تم

اپنوں اور پرایوں

دائیں اور بائیں بازو

مغرب اور مشرق

کے جھگڑوں میں الجھا ہے

اس کا دامن اپنے بھائی کے خون سے

آلودہ ہو گیا ہے

اور وہ

یا قتل کا مرتکب ہوا ہے

یا خودکشی کا

میں نے ابھی اس کا ہاتھ پکڑ ہی رکھا تھا کہ وہ

بے ہوشی کی سیڑھیاں اترنے لگی

ڈاکٹر کہنے لگا

ہم اس کے بارے میں

متفکر ہیں

وہ ساری رات

نیند میں

کویت عراق اور امریکہ کے نام بڑبڑاتی ہے

ڈراؤنے خواب دیکھتی ہے

اور سارا دن

خون تھوکتی رہتی ہے

ری ۱۹۹۱ء

میں ایک دفعہ پھر
ڈرتے ڈرتے
امید و بیم کی لہروں پہ ہچکولے کھاتے
ہسپتال پہنچ گیا
ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ
وہ زندگی اور موت کی جنگ سے باہر نکل آئی ہے
وہ کہنے لگا
وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ
ہم نے
اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اشتہار دیے
آخر ہماری کوششیں
بار آور ثابت ہوگئیں
چار لوگ خون دینے آئے
ان میں سے
دو مرد تھے اور دو عورتیں
ایک مرد روس کا تھا ایک کیوبا کا
ایک عورت سائپرس کی تھی ایک ہندوستان کی
ان خون کے تحفوں کی وجہ سے
اس کی جان بچ گئی
لیکن اس کا مستقبل
میں سراپا سوال تھا

وہ زندہ تو رہے گی

لیکن

(پھر ڈاکٹر قدرے خاموش ہو گیا)

کافی عرصے تک صحتمند نہ ہو سکے گی

میں اس کے سرہانے کھڑا تھا

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا

وہ تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی

میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تو

اس نے آنکھیں کھولیں

اور اس کی آنکھوں میں

چند لمحوں میں

ماضی کے سارے منظر لہرا گئے

پھر ہم دونوں نے مل کر

ایک موم بتی جلائی

ایسی موم بتی

جو ہمارے

ماحول کے لیے روشنی کا پیغامبر

اور

فردا کے مسافروں کے لیے

زادِ راہ تھی۔

نوٹ: (مشرق وسطیٰ کی جنگ کو روکنے میں روس، کیوبا، سائپرس اور ہندوستان نے اہم کردار ادا کیا تھا

مارچ ۱۹۹۱

ایک جرنلسٹ کی ڈائری
(مشرق وسطیٰ کے بحران کے پس منظر)

ستمبر ۱۹۹۰ء

امریکہ کی خارجی پالیسی

وہ جس سے
رات کو ہم بستری کرتی ہے
صبح ہوتے ہی
اسے قتل کروا دیتی ہے
پھر بھی
اس کے عاشقوں کی فہرست طویل ہے

اکتوبر ۱۹۹۰ء

کھسیانی ہنسی

ایک امریکی جرنلسٹ نے جب
مشرق وسطی بھیجی ہوئی فوج
کے ایک سپاہی سے پوچھا
''تم نے ہزاروں میلوں کا فاصلہ کیوں طے کیا ہے؟
تمہاری فوجوں، تمہاری ٹینکوں اور عیار طیاروں
کا مقصد کیا ہے؟''
تو وہ سپاہی
پہلے مسکرایا
اور پھر لاپرواہی سے بولا
''تاکہ ہمارے ملک کے شہری
جب کار کا ٹینک بھریں
تو چند سکے بچا سکیں''
اور
اس جرنلسٹ کی آنکھوں میں
انسانی ناانصافیوں، کمزور ملکوں کے تحفظ
اور
بین الاقوامی امن کے بیسیوں سوال
کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے

جنوری ۱۹۹۱ء

اقوام متحدہ

فوجیوں کے بوٹوں تلے
نجانے کتنے پھول مسلے گئے
بندوقوں کی آواز سے
نجانے کتنے پرندے گھونسلے چھوڑ کر چلے گئے
گولیوں کی بوچھار سے
نجانے کتنے بچوں کی گردنیں ڈھلک گئیں
ٹینکوں کے بوجھ تلے
نجانے کتنے کھیت بانجھ ہو گئے
بموں کے دھماکوں سے
نجانے کتنے شہر دھویں میں تبدیل ہو گئے
اور افسوس یہ کہ اس دفعہ
اقوامِ متحدہ نے
امن کی دیوی کے سینے میں خنجر
خود اپنے ہاتھوں سے گھونپ دیا

جنوری ۱۹۹۱ء

دو فوجی کمانڈر

ایک امریکی کمانڈر کو حکم ملا
"تم فوج کی کمان سنبھالو
آگے بڑھو
اور
ہزاروں عراقی سپاہیوں کو
بموں سے تباہ کرو"
اس نے حکم کی تعمیل کی
ایک عراقی کمانڈر کو حکم ملا
"تم فوج کی کمان سنبھالو
آگے بڑھو
اور
ہزاروں امریکی سپاہیوں کو
کیمیکل ویپنز* سے جلا کر راکھ کر ڈالو"
اس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا

فروری ۱۹۹۱ء

FRIENDLY FIRE

نفرت کے سورج سے
ہماری آنکھیں
اتنی چندھیا گئی تھیں
کہ ہمیں
دوست بھی دشمن نظر آتے تھے

فروری ۱۹۹۱ء

کویت میں تیل کے کنوؤں کو جلانا

ایک نادان بچے نے غصے میں کہا
اگر تم مجھے ان کھلونوں سے نہیں کھیلنے دو گے
تو میں تمہیں بھی نہیں کھیلنے دوں گا
اور
ان کھلونوں کو توڑ ڈالوں گا

مارچ ۱۹۹۱ء

HANG OVER

وہ سیاستدان
جو
سیاسی مسائل کا
فوجی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں
ان
شرابیوں کی یاد دلاتے ہیں
جو اپنے غم
شرابوں میں گھول کر پی جاتے ہیں
اور صبح
یہ جان کر حیران ہوتے ہیں
کہ انہیں
غموں کے ساتھ ساتھ
ہینگ اوور☆ کا بھی سامنا ہے

مارچ ۱۹۹۱ء

A NEW WORLD ORDER

وہ ایک ایسے محل کا خواب دیکھ رہے ہیں
جس کی بنیادیں نفرت پر استوار ہوں گی
جس کی عمارت سونے کی اینٹوں سے بنائی جائے گی
جس کی دیوار پر فوجی ہتھیار سجائے جائیں گے
اور
جس کے باغ میں تیل کی نہریں، بہیں گی
لیکن اس محل میں
آئینے نہیں ہوں گے
اور پھر ایک دن
ایسا زلزلہ آئے گا
کہ ساری عمارت
کھنڈرات میں تبدیل ہو جائیگی
اور اس میں رہنے والے لوگوں کی لاشیں
ایک نئے محل کی بنیادوں میں کام آئیں گی
اور پھر
ایک اور نئی دنیا کا خواب دیکھا جائے گا

آوازیں

(ایک ایڈیٹر کی ڈاک)

مارچ ۱۹۹۱

سویڈن سے ایک خط

آپ مبارکباد کے مستحق ہیں
آپ نے اس دور میں
جب سیاسی اور مذہبی رہنما تعصبات کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں
عوام میں افہام وتفہیم کے پل تعمیر کرنے کا تہیہ کیا ہے
عوام
سیاسی اور مذہبی لیڈروں سے زیادہ
طاقتور بھی ہوتے ہیں اور ایماندار بھی
یہی وہ راستہ ہے
جو ہمیں
امن کی منزل تک لے جائے گا

روس سے خط

آج
ہم اس دور میں زندہ ہیں
جب جنگ کے دیوتا نے
امن کی دیوی کی
عصمت لوٹ لی ہے

کنیڈا سے خط

کینیڈین حکومت
پچھلے چالیس برس سے
دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے
لیکن جب سے
کینیڈین حکومت نے
امریکی حکومت کے نقش قدم پر چلنا
اور
ان کی ہر بات پر لبیک کہنا
شروع کر دیا ہے
ہمیں
بہت دکھ ہوا ہے

امریکہ سے خط

پہلے ہم نے شاہ ایران کے مظالم کی حمایت کی
پھر ایران سے جنگ لڑی
اس کے بعد صدام حسین کا برسوں ساتھ دیتے رہے
پھر عراق کو تباہ کر دیا
نجانے اب
قرعہ فال کس کے نام نکلے گا؟

اُردن سے خط

ہمیں
اس بات پر فخر ہے کہ
شاہ حسین نے
عراق کے معصوم عوام پر
امریکی بربریت کے خلاف
آواز بلند کی
اور جب امریکی حکومت نے
باون ملین ڈالر کی امداد روکنے کی دھمکی دی
تو انہوں نے کہا
WE MIGHT BE POOR BUT WE ARE NOT CHEAP

پاکستان سے خط

جب مسلمان
مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں
اور
ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگیں
تو ہمارے
جنگ جمل کی تلخ یادوں کے زخم
ہرے ہو جاتے ہیں

ایک فلسطینی کا خط

مشرق وسطیٰ میں
اس وقت تک
پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا
جب تک
اس خطے میں
دولت کی مساوی تقسیم نہ ہو
اسلحہ و بارود کے کارخانے بند نہ ہو جائیں
اور
عرب ممالک اسرائیل کو
اور
اسرائیلی فلسطینی ریاست کو
قبول نہ کر لیں

ایک بیرونِ ملک کویتی کا خط

جو ممالک
اپنی خوراک
اپنے لباس
اپنے آرام
اپنے عیش
اور
اپنے دفاع کیلیے
غیروں کے دست نگر ہوں
ان کا
اپنی آزادی
اور خود مختاری
پر فخر کرنا
ایک دیوانے کی بڑ نہیں
تو اور کیا ہے

والدہ

تخلیق : پروفیسر اقبال احمد
ترجمہ : خالد سہیل

وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ان کا بیٹا فون کا جواب دینے کے لئے لونگ روم میں گیا۔

"ابو! آپ کا فون ہے۔ کراچی سے آیا ہے"

منصور بیگ نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور فون کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی بہن کا فون تھا۔ وہ رو رہی تھی "والدہ کا ایک گھنٹہ پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ آج انہیں دفنا دیا جائے گا اور ان کا سوئم تین دن کے بعد ہو گا"۔

"اس کی بیوی اور دو بچوں نے جو باورچی خانے کی میز پر کھانا کھا رہے تھے اس کی گفتگو اور خاموشی سنی۔ خیریت تو ہے اس کی بیوی نے پوچھا۔ والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ باجی کا فون ہے"۔

اس کی بیوی نے عربی میں مرحومہ کیلئے دعائے مغفرت پڑھی۔

منصور کو والدہ کی وفات کی خبر سن کر کوئی دکھ نہ ہوا تھا بلکہ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے شانوں سے بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے کئی دفعہ اس خدا سے جس پر وہ ایمان نہ رکھتا تھا، دعا کی تھی کہ وہ اس کی والدہ کو

اٹھالے۔ وہ اپنی بہن سے کہنا چاہتا تھا کہ اچھا ہوا والدہ فوت ہو گئیں کیونکہ اس طرح ان کے دکھوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ تقریباً ایک سال سے بیہوش تھیں اور اس سے پہلے بھی وہ تقریباً چھ مہینے مفلوج رہ چکی تھیں۔ ان دنوں وہ کم از کم دیکھ تو سکتی تھیں۔ اگرچہ باتیں نہ کر سکتی تھیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ موت نے والدہ پر رحم کھایا ہے لیکن اس کی بہن اتنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ اتنی غمزدہ تھی کہ وہ افسوس کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ جب گفتگو ختم ہوئی تو وہ واپس باورچی خانے میں جانے کی بجائے لونگ روم کی تاریکی میں ہی کچھ دیر بیٹھا رہا۔ باورچی خانے سے آنے والی آوازیں بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئیں اور اس دن شام کا کھانا وقت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

چند منٹوں کے بعد اس کی بیوی چائے کی پیالی لے کر اسکے پاس آئی۔ ''تھوڑی سی چائے پی لو'' اس نے کہا ''تم نے کھانا بھی ختم نہیں کیا تھا'' اس نے چائے کی پیالی چھوٹی میز پر رکھی اور بجلی جلا دی۔ جب روشنی ہوئی تو وہ تاریک غار سے نکلا۔ اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ اپنی بہن سے کیا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔ وہ اپنی بہن کو نہ بتا سکا کہ زندگی کتنی بے معنی اور ہٹ دھرم واقع ہوئی ہے۔ قدرت کو اس کی والدہ کے بوڑھے گلے کو ریشہ ریشہ کاٹنے میں دو سال لگے تھے۔ اس کے من میں غصے کی لہریں ابھرنے لگی تھیں۔

''اوہ! اس نے کتنے دکھ جھیلے تھے'' وہ بولا

''ہاں'' اس کی بیوی نے اس سے اتفاق کیا

''لیکن کیوں؟'' اس کی آواز میں تلخی ابھر آئی تھی۔

اس کی بیوی خاموش رہی۔ اس نے اس کے باقی کلمات بھی خاموشی سے سنے اور پھر بولی ''تمہیں کراچی جانا چاہیے''

یہ مشورہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔

''کیوں؟ انہیں تو آج دفن کر دیا جائے گا''

''نہیں میں سوئم کے لئے کہہ رہی ہوں''

وہ اپنی بیوی کے مشورے کی منطق کو نہ سمجھ سکا

''کیا اسے کرہ ارض کی دوسری طرف اس لئے سفر کرنا چاہیئے تاکہ وہ ایک مردہ عورت کی، جو دفنائی بھی جا چکی تھی، روایتی دعا میں شریک ہو سکے''

اس کے ذہن میں یہ خیال آیا لیکن پھر بھی اس نے مزاحمت کیے بغیر اپنی بیوی کا مشورہ قبول کر لیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد اس کے بیٹے نے اطلاع دی'' آپ کی کل شام ایر کنیڈا کی پرواز 651 سے ریزرویشن ہو گئی ہے''

''کیا''اس نے اعتراضاً نہیں بلکہ حیرت سے کہا۔

پہلے تو وہ بغیر سوچ سمجھے کراچی کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ پھر اس نے یہ تصور نہ کیا تھا کہ یہ سب انتظامات ایک فون کرنے سے ہو جائیں گے لیکن اب جبکہ وہ انتظامات ہو چکے تھے اس کی حیرت فرحت بخش تھی۔

وہ کنیڈا میں پچیس سال سے رہ رہا تھا۔ ایک ربع صدی ہونے کو آئی تھی۔ اس نے نہ صرف نئی دنیا کے اطوار اپنا لئے تھے بلکہ وہ اسے پسند بھی تھے۔ اگرچہ انداز فکر اور طرز زندگی میں یہ تبدیلی آسانی سے نہ آئی تھی۔ مثال کے طور پر اسے ٹیلیفون کی سہولت پسند تھی لیکن وہ مشینوں سے بات کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دروازے کی ہتھی یا فرنیچر سے بات کر رہا ہو۔ یہی حال انگریزی زبان کا تھا اگرچہ انگریزی زبان میں وہ جو کام بھی کرتا تھا وہ تسلی بخش ہوتا تھا لیکن اسے اب بھی یوں محسوس ہوتا جیسے انگریزی زبان اس کے ذہن میں اوزار کی طرح ہو بازو کی طرح نہ ہو۔

اگلے دن جب وہ کالج گیا تو اسے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ Semester کے دوران ایک ہفتے کی چھٹی مانگے گا تو چیرمین کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوں گے کیونکہ سولہ مہینوں میں

پاکستان کا یہ اس کا دوسرا دورہ تھا۔ پہلی دفعہ جب اس کی والدہ بہت بیمار تھیں تو اسے جانا پڑا تھا اور اب جب کہ وہ فوت ہو چکی تھیں۔ لیکن چیرمین نے بڑے خلوص سے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

”دس دن کی چھٹی لے لو۔ جب تم اتنی دور جاؤ گے تو کچھ دن خاندان کے ساتھ بھی گزار لینا۔ ہم تمہاری کلاسوں اور Lab کا خیال رکھیں گے“

شام کو وہ ہوائی جہاز میں تھا وہ اپنے ساتھ کچھ تدریس کا کام بھی لے آیا تھا لیکن اس کا جی کام میں نہ لگا اور وہ اپنی والدہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

وہ اپنی بیماری کی خود ذمہ دار تھیں کیونکہ انہوں نے ایک دن اپنے گھر کے صحن میں ایک آسیبی کھیل کھیلا تھا جس سے انکی بیماری کا آغاز ہوا تھا انکا ایک بیٹا جو کراچی کا ایک جانا پہچانا سرجن تھا۔ لندن ایک کانفرنس میں شرکت کرنے اور اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانے گیا تھا۔ اسے کبھی کبھار سینے میں درد ہوتا تھا اور وہاں اس کے زمانۂ طالب علمی کے کئی دوست تھے جو اب ماہر امراضِ قلب بن چکے تھے۔

اسے ایک ہفتے میں لوٹ آنا تھا لیکن ماہرین نے اسے بتایا کہ اس کے دل کی رگیں اس حد تک متاثر ہو چکی ہیں کہ اسے فوراً دل کا آپریشن کرالینا چاہیے چنانچہ وہ لندن میں رک گیا۔ جب والدہ نے پوچھا کہ وہ لوٹ کر کیوں نہیں آیا تو بہانہ بنایا گیا کہ وہ اپنی ریسرچ میں مصروف ہو گیا تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ان کی پریشانی بڑھتی گئی۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو“ انہوں نے رشتہ داروں سے پوچھا لیکن کسی نے اقرار نہ کیا۔

جس دن ان کے بیٹے کا آپریشن تھا۔ اس دن انہیں یا تو کسی غیبی آواز نے بتایا تھا اور یا انہوں نے اہل خاندان کے چہرے پڑھ لئے تھے۔ وہ اپنے پاندان کے پاس برآمدے میں دیوان پر بیٹھی تھیں کہ اچانک انہوں نے چھلانگ لگائی اور ننگے پاؤں، ننگے سر صحن کی طرف بھاگیں۔ انہوں نے اپنے بازو ہوا میں

بلند کئے، سر کے دوپٹے کو ایک کشکول بنا کر اپنے بازوؤں پر پھیلایا، اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں ''اے مالک! میرے بچے پر رحم کر۔ میری زندگی کی قربانی قبول کر لے لیکن میرے بیٹے کو بخش دے''

والدہ کی چیخیں سن کر سب لوگ کمروں سے نکل آئے

''امی آپ کیا کر رہی ہیں'' نجیبہ والدہ کو اپنے بازوؤں میں لیتی ہوئی چیخی۔

''میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے'' انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''رشید بھائی بخیریت ہیں'' نجیبہ نے تسلی دی اور انہیں واپس برآمدے میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ والدہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھیں اور پھر راستے میں ہی بیہوش ہو گئیں۔ اس واقعہ سے تو گھر میں کہرام مچ گیا انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی۔

انہیں دو دن تک ہوش نہ آیا۔ تیسرے دن جب انہیں ہوش آیا تو ان کے ہونٹوں پر یہ سوال تھا ''اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے'' کسی نے انہیں بتایا کہ رشید کے دل کا آپریشن ہوا تھا اور وہ کامیاب رہا تھا۔

''اے مالک! میں تیرا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں'' وہ بڑبڑائیں۔

''لاکھ لاکھ شکر'' پھر انہوں نے آنکھیں موند لیں اور سو گئیں۔ جب وہ دوسرے دن جاگیں تو اپنی گویائی کھو چکی تھیں۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ تو سکتی تھیں لیکن بات نہ کر سکتی تھیں۔ اس حادثے کے بعد ان کی حالت دن بدن بدتر ہوتی گئی اور وہ بازوؤں اور ٹانگوں کے استعمال سے معذور ہو گئیں۔

نومبر میں صفدر والدہ کی مزاج پرسی کے لئے کراچی گیا تھا۔ انہیں ہسپتال کے بستر میں سہارا دے کر بٹھایا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں درد کا ایک بحر بیکراں پھیلا ہوا تھا وہ آنکھیں اسے کافی دیر تک گھورتی رہیں لیکن ان میں اپنائیت کو کوئی سایہ نہ لہرایا۔

''ماں جی! میں صفدر ہوں

کوئی ردعمل نہ ہوا۔

''کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا''؟

وہ پھر بھی خاموش رہیں۔

اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ اپنی والدہ کی آغوش میں سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا۔ انہوں نے پھر بھی کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ صفدر نے اپنا سر اٹھایا تو اس کی والدہ کی آنکھوں میں اس وقت بھی درد کے سائے لہرا رہے تھے۔

''کاش وہ اب مجھے کبھی نہ پہچانیں'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''میری دعا ہے کہ وہ اپنی ناگفتہ بہ حالت سے غافل ہی رہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ اپنے حواس کھو چکی تھیں لیکن وہ اس جواب سے پورا مطمئن نہ تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ اتنی غمزدہ کیوں نظر آتی تھیں؟ کیا وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھتے دیکھ رہی تھیں؟''

صفدر جب ہسپتال سے لوٹ رہا تھا تو بہ ظاہر وہ خاموش تھا لیکن اس کے دل میں درد اور غصے کے دریا بہہ رہے تھے۔ ''یہ کیسا خدا ہے جو ایک مجبور ومعذور عورت کی زندگی سے کھیل رہا ہے'' لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ ایسے خدا پر الزام لگا رہا تھا جس پر وہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔

اس کے کراچی پہنچنے کے بعد اس کی بہن بھی بلجیم سے آگئی۔ جس کے ساتھ اس کا دو سال کا بچہ تھا۔ شام کو جب خاندان والے ہسپتال گئے تو اس بچے کو بھی ساتھ لے گئے۔ صفدر نے دیکھا کہ جب اس کی والدہ نے بچے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کا درد چند لمحوں کیلئے رخصت ہو گیا وہ یہ تبدیلی دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

اگلے دن جب بچے نے شرارت میں ایک گالی دی جو اسکے ایک چچا نے

اسے مذاق میں سکھائی تھی۔ تو والدہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس واقعہ کے بعد اس بچے کا ہسپتال جانا ضروری ہو گیا۔ صفدر نے سوچا کیا وہ اس بچے کو پہچانتی ہیں؟ کیا وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہیں؟ شاید نہیں۔ شاید وہ ایک ازلی وابدی عورت کا ایک ازلی و ابدی بچے کو دیکھ کر ردعمل تھا۔ وہ ایک ایسے رشتے میں منسلک تھے جو انسانی شخصیتوں سے ماورا ہوتا ہے۔

صفدر واپس ٹورانٹو آ گیا۔ لیکن اس کی والدہ کی صحت کی ابتری کی خبریں آتی رہیں۔ جلد ہی اس ازلی وابدی عورت کا ردعمل بھی عنقا ہو گیا۔ والدہ ایک دن ایسی بیہوش ہوئیں کہ انہوں نے پھر آنکھیں نہ کھولیں۔ ان کا جسم کام کر رہا تھا لیکن ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ ان کا منہ کھول کر کھانا کھلاتے اور وہ بے ہوشی میں ہی کھانا کھا لیتیں۔

اب اسے اپنی والدہ کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ ان کی موت کی دعائیں کیا کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ ایک دن ان کے شعور کا شعلہ لپکے گا اور وہ اپنے آپ کو ایک زندہ لاش پائیں گی۔

''ماں! تم مر کیوں نہیں جاتیں'' یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے دل میں خدا کے لئے نفرت کا طوفان امڈ آتا۔

ہوائی جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو اس کا ایک بھتیجا اسے لینے آیا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے کار کا سفر کرتے رہے۔ آخر لڑکے نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''نانی اماں بستر میں مری ہوئی پائی گئی تھیں''

وہ خاموش رہا

''ان کا وزن آدھا رہ گیا تھا۔ یوں لگتا ہے ہڈیوں کے پنجے پر جلد چڑھا دی گئی ہو''۔

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا

وہ خوش تھا کہ وہ تجہیز و تکفین کے وقت موجود نہ تھا اور اسے والدہ کا

ڈھانچہ نہ دیکھنا پڑا تھا۔

وہ شاہراہ سے اتر کر ایک رہائشی بستی کی گلیوں سے گزر رہے تھے۔ لوگوں کے گھروں کی خستہ دیواروں پر صبح کی روشنی میلی میلی لگ رہی تھی۔ اس نے تازہ ہوا کے لئے کار کی کھڑکی کھولی۔ کبھی کبھار ماحول کی بدبو کار میں داخل ہوتی۔ چونکہ صبح کا وقت تھا اس لئے سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھی۔ البتہ چاروں طرف آوارہ کتے بے کار گھوم رہے تھے۔ ایک تو انکی کار کے نیچے آتے آتے بچا۔ لڑکے نے کتے کو بچانے کے لئے بریکوں پر پاؤں رکھا اور کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گلیوں میں مرغیاں بھی کافی تھیں، جو گندگی کے ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے حواس پر تھوڑی ہی دیر میں اتنے حملے ہو چکے تھے کہ اسے ٹورانٹو کی صاف ستھری اور پاک صاف فضا یاد آنے لگی۔ ''اس پورے شہر کو ایسے ہی دھونے کی ضرورت ہے'' اس کے مضطرب ذہن نے سوچا'' جیسے لوگ میلی کاروں کو دھوتے ہیں''

سوئم میں کافی گہما گہمی تھی۔ تقریباً چار سو لوگ آئے ہوئے تھے۔ مردوں کے لئے ہمسایے کے ڈاکٹر کے کشادہ گھر کے احاطے میں ٹینٹ لگا دیا گیا تھا اور عورتیں گھر کے اندر تھیں۔ ان مہمانوں میں رشتہ دار بھی شامل تھے، دوست بھی اور ہمدرد اجنبی بھی۔ جو مرحومہ کے سوئم میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مہمانوں کو مجلد سیپارے دیے گئے، جو انہوں نے آپس میں تقسیم کر لئے۔ ان کا ایمان تھا کہ جتنا زیادہ قرآن پڑھا جائے گا۔ اتنا زیادہ ہی مرحومہ کو ثواب ہو گا۔ جب قرآن خوانی ختم ہوئی تو لوگ چائے پینے، لوازمات کھانے اور آپس میں بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئے۔

صفدر کی اپنے ایک کزن سے ملاقات ہوئی جو کراچی یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے پروفیسر تھے۔

''اسلام علیکم صفدر بھائی''

''ہیلو رضوان'' صفدر نے جواب دیا

''آپ کی والدہ کی روح اس بات سے بہت خوش ہوئی کہ آپ کینڈ
سے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرنے تشریف لائے''۔

صفدر نے اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا ''میرا نہیں خیال
رضوان کہ ہمارے دعا کرنے یا نہ کرنے سے مُردوں پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ و
ہمارے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہ تو زندگی اور موت سے بھی بے نیاز
ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت کے بارے میں تو صرف زندہ لوگ پریشان رہتے
ہیں۔ ہم یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ سکون دل حاصل کر سکیں۔ خاص کر
اگر موت ہماری آنکھوں کے سامنے کسی کو ہم سے چھین لے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہماری دعائیں عالم ارواح تک نہیں پہنچتیں۔''
رضوان نے استفسار کیا؟

''نہیں میرا مطلب ہے کہ کوئی عالم ارواح نہیں ہے''

''تو پھر مردوں کی روحیں کہاں جاتی ہیں؟''

''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ جب شمع بجھ جاتی
ہے تو اس کا شعلہ کہاں جاتا ہے''

''یہ ایک دلچسپ خیال ہے لیکن اس کا ہمارے موضوع سے کیا تعلق ہے''

''کیوں نہیں''

''یہ ایک اچھی دلیل ہے لیکن تم نے ایمان کے عنصر کو نظر انداز
کر دیا ہے'' اس کے کزن نے کہا۔

''میں نے خوابوں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ صفدر نے جواب دیا

''لیکن ایمان خواب نہیں ہے۔ وہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ وہ
انسانی ذہن کے لئے ایک لنگر کا کام کرتا ہے۔ وہ اسے روح مطلق سے ملاتا ہے۔
وہ اسے زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کے سمندر میں گمراہ ہونے سے بچاتا ہے۔ جو

ذہن ایمان کے لنگر سے محروم ہوتا ہے وہ تند و تیز موجوں کے ساتھ ہچکولے کھاتا رہتا ہے اور پھر ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے جس انسان کی زندگی ایمان کی دولت سے خالی ہو وہ پریشان اور خوفزدہ رہتا ہے اور اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے

''رضوان! تمہارا فلسفہ حقیقت سے فرار کے علاوہ کچھ نہیں، جس نے تمہارے ذہن کو مسحور کر رکھا ہے''

لیکن روح آئی کہاں سے ؟'' رضوان نے گفتگو کو از سر نو شروع کرنا چاہا۔

''جسم سے ''صفدر نے کہا'' جیسے روشنی کی کلی شمع کے جسم سے پھوٹتی ہے''۔

''تم مغرب میں زیادہ وقت گزار چکے ہو۔ اس کے کزن نے کہا ''میرے لئے روحانی زندگی ایک واضح حقیقت ہے۔ وہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں منطق کی مکھیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ویسے تمہاری ''روشنی کی کلی'' ایک خوبصورت تشبیہ ہے''

''تمہاری ''مکھیوں'' کی تشبیہ بھی بری نہیں''

والدہ بھی عالم ارواح پر ایمان رکھتی تھیں اور والدہ کی والدہ بھی۔ صفدر کو وہ گفتگو یاد تھی جو اس نے دس برس کی عمر میں اپنی والدہ اور نانی کے درمیان سنی تھی۔

''بیٹی کیا تم جانتی ہو کہ اس نے کیا کہا تھا''

''کس نے کیا کہا تھا؟''

''تمہاری نانی نے'' (جنہیں فوت ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے)

''کیا کہا تھا؟''

''وہ میرے خواب میں آئیں اور کہا ''مجھے سردی لگ رہی ہے'' صفدر کی نانی ہر سال سردیوں میں اپنی مرحومہ والدہ کے ایصال ثواب کے لئے دس لحاف بنوا کر غریبوں میں تقسیم کیا کرتی تھیں۔ جس سال وہ ایسا کرنا بھول گئی

تھیں اس سال انہیں یاد دہانی کرائی گئی تھی۔ اسی دن روئی منگوائی گئی اور روئی دھنکنے والے کو بلایا گیا۔ صفدر کو روئی دھنکنے والا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے جب اپنا کام شروع کیا تو روئی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑا، فرش پر بچھایا اور پھر روئی دھنکنے لگا۔ روئی دھنکتے وقت خاص قسم کی آوازیں پیدا ہوتیں تن تن تن تانی تن تن تانی۔ صفدر سارا دن مخصوص موسیقی سنتا رہا۔ وہ کبھی کبھار دروازہ کھول کر روئی دھنکنے والے کو دیکھتا تو اسے وہ روئی کے دھنویں میں چھپا نظر آتا اس نے اپنے منہ اور ناک پر رومال باندھ رکھا تھا اور اسکا سر اور ابرو اڑتی ہوئی روئی کے ٹکڑوں سے سفید ہو چکے تھے۔ شام تک ساری روئی دھنکی جا چکی تھی اور اس نرم و ملائم روئی کا پہاڑ بن چکا تھا۔ اگلے دن پانچ نوجوان عورتوں کو بلایا گیا، جنہوں نے فنکارانہ طور پر اس روئی کو لحافوں میں ڈال کر سی دیا اور پھر وہ لحاف محتاجوں کے گھروں تک پہنچ گئے۔

اس کی والدہ کا ایمان تھا کہ دونوں دنیائیں! گوشت پوست کی عارضی دنیا بھی اور روح کی مستقل دنیا بھی، خدا کے اختیار میں ہیں۔ وہی ارض و سما کا مالک ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ اسی یقین نے والدہ کی زندگی کو سہارا دے رکھا تھا۔

والدہ کی زندگی کی دوسری اٹل حقیقت اس کے بچے تھے۔ جن سے وہ محبت کرتی تھی وہ اپنے شوہر سے محبت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی اجازت نہ دیتا تھا وہ ایسے ماحول میں پلی بڑھی تھی جہاں شوہر بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور بیوی سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ شوہر کی تابع فرمان رہے۔ شوہر کو مجازی خدا تصور کیا جاتا تھا۔

والدہ کے ذہن میں صرف خدا ہی بادشاہ تھا اور مالک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جو ہستی رات کے وقت عورت کے ساتھ سوتی ہے وہ کمزوریوں کی مالک ہے اور خدا نہیں ہو سکتی۔ چاہے وہ دن کو کیسا ہی ڈھونگ رچائے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس نے خاوند کے خلاف کبھی بغاوت کا نعرہ بلند نہ کیا۔ وہ ایسا تصور بھی نہ

کر سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کا رشتہ کافی کھوکھلا تھا، اس میں وہ لطافتیں مفقود تھیں جو دو محبت کرنے والوں کے یکجا ہونے سے پیدا ہوتی ہیں وہ علیحدہ علیحدہ انسان تھے جس میں ایک دوسرے کا استحصال کر رہا تھا۔ لیکن بچوں کی محبت میں ایسی قباحتیں نہ تھیں وہ انہیں جو چاہتی دیتی اور ان سے جو چاہتی لیتی۔ بچوں کے لئے اس کی محبت بے پایاں تھی جو اس پر عالم بے خودی طاری رکھتی تھی۔

والدہ ان دونوں حقیقتوں کو دل سے لگائے زندگی گزارتی رہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن ان دونوں حقیقتوں کا ٹکراؤ ہو گیا اور ان کے ذہن میں بھونچال آ گیا۔ صفدر کا سب سے چھوٹا بھائی فیروز۔ جو ایک وجیہہ جوان تھا، اچانک فوت ہو گیا۔ وہ ایک صبح مسکراتے ہوئے ایئر فورس کے دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا اور چار گھنٹے کے بعد ایمبولنس اس کی مسخ شدہ لاش لے کر آئی وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

والدہ کا غم سے برا حال تھا انہوں نے بال نوچے، دیواروں سے سر ٹکرایا اور چیخ چیخ آسمان سر پر اٹھا لیا ان کی طبیعت بہتر کرنے کیلئے انہیں مسکن ادویہ دینی پڑیں۔

ان کا خاوند بھی جو ایک پکا مسلمان تھا اندر سے ایک پتے کی طرح کانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھ سے نہ تو کوئی آنسو بہا اور نہ منہ سے کوئی چیخ نکلی وہ ایک نابینا شخص کی طرح جائے نماز کی طرف بڑھا، اس پر بیٹھا اور پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا، اے خدا! تو ہی اس کا مالک ہے۔ تو نے ہی اسے ہمیں ایک امانت کے طور پر دیا تھا تو نے ہی اسے واپس لے لیا۔ اے مالک! ہم تیری رضا میں راضی ہیں، وہ یہ کلمات بار بار دہراتا رہا۔

والدہ کے دکھ میں ہفتوں کمی نہ آئی اس کے خاوند نے جب انہیں رضائے الٰہی کے آگے سرنگوں ہونے کو کہا تو وہ کہنے لگیں ”میں یہ سب کچھ جانتی اور مانتی ہوں لیکن میں ایک ماں کے دل کو کیا کروں“ چند مہینوں کے بعد آنسو

خشک ہو گئے لیکن دل کی آہیں، تیرہ سال تک نہ گئیں۔

"وہ مجھ سے ناراض ہے" وہ اپنے مردہ بیٹے کے بارے میں کہا کرتیں۔ "کیونکہ وہ مجھ سے خواب میں ملنے نہیں آتا۔ وہ اوروں سے ملنے آتا ہے لیکن مجھ سے ملنے نہیں آتا" وہ سوچتیں "میں نے بہت زیادہ آہ وزاری کی ہے شاید وہ خدا کو پسند نہ آئی۔ یہ میری سزا ہے۔ میں نے بہت زیادہ آنسو بہا کر فیروز کیلئے اچھا نہیں کیا"

اور پھر وہ اقبال کی نظم "ماں کا خواب" پڑھنے لگتیں۔

اس نظم میں ایک ماں جب اپنے خواب میں بیدار ہوتی ہے تو اپنے آپ کو ایک ویران علاقے میں پاتی ہے۔ وہ ایسے علاقے میں پہلے کبھی نہ آئی تھی وہ اپنے چاروں طرف دیکھتی ہے تو اسے کچھ فاصلے پر چراغوں کی ایک زنجیر نظر آتی ہے وہ قریب جاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ بچوں کی ایک قطار ہے جو اپنے اپنے ہاتھوں میں چراغ پکڑے ہوئے ہیں۔ اس قطار کے آخر میں ایک بچہ ایسا ہے جسے چلنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اسکی شمع بجھ چکی ہے اور وہ قافلے سے پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ جب اس بچے کے قریب جاتی ہے تو اسے پہچان لیتی ہے وہ اس کا اپنا مرحوم بیٹا ہوتا ہے۔ وہ بھاگ کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ وہ اس کی جدائی میں دن رات آنسو بہاتی رہی ہے۔ لڑکا اپنا منہ موڑ لیتا ہے اور کہتا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت آنسو بہاتی رہی ہو لیکن تمہارے آنسو نے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا دیکھو تمہارے آنسوؤں نے میری شمع بجھا دی ہے"

شاید والدہ وہی غلطی دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھیں اسی لئے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کے لئے اپنے خدائے عزوجل کے حضور میں دعا مانگی تھی اور اس سے پہلے کہ موت کی تلوار ان کے بیٹے پر آ کر گرتی انہوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا اور اس تلوار نے ان کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔

جب صفدر منطق کی عینک لگا کر والدہ کی دنیا میں جھانکتا تو واقعات کی اس

تفسیر کو بالکل قبول نہ کرتا لیکن وہ اپنے دل و دماغ سے ان خیالات کو مستقل طور پر نکال بھی نہ سکتا تھا وہ یادوں کے سایوں میں کہیں چھپے رہتے اور جب موقع ملتا تو سر اٹھا لیتے۔

وہ کراچی کے قیام کے آخری دن اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دینے گیا۔ اس نے پانی چھڑکتے اور پھول بکھیرتے ہوئے کہا "ماں جی! اب، آپ اس قبر میں آرام کی نیند سوئیں گی۔ اب یہاں کوئی بھی آپ کو دکھ پہنچانے نہیں آئے گا۔ آپ کا خدا بھی نہیں" صفدر کی واپسی کی پرواز پر سکون تھی۔ اس نے مسافروں سے گفتگو نہ کی۔ وہ مطالعہ کرتا رہا اور مشروبات سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ سات سمندر پار کر کے جب وہ کینڈا کے ساحل کے قریب پہنچا تو اس نے اگلی سیٹ کے پیچھے رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کتاب کے درمیان میں پروازوں کے راستوں کا ایک نقشہ تھا۔ سبز زمین اور نیلے سمندر پر بڑے سلیقے سے کالی لکیریں کھینچی گئی تھیں جو بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

صفدر کو اچانک محسوس ہوا جیسے وہ اس کی والدہ کے روحانی سفر کا نقشہ ہو۔ جس میں مختلف ارواح، مختلف منازل کی طرف مائل بہ پرواز ہوں۔ بعض روحیں جنت کے خوبصورت شہروں اور متبرک وادیوں کی طرف اور بعض جہنم کے مردود دیہاتوں کی طرف اڑ رہی ہوں۔

اچانک ہوائی جہاز کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ اپنی سیٹ میں اچھل پڑا۔ جہاز میں "اپنی سیٹوں کے بند باندھیے" کا نشان روشن ہو گیا۔ اس نے بیلٹ باندھ لی اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ ایک بادل میں سے گزر رہے تھے لیکن وہ سفر ایک نا ختم ہونے والا سفر لگ رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے بادل نے کھڑکی پر برسنا شروع کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کے سب مناظر غائب اور سب مسافر اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ دھند میں اکیلا سفر کر رہا تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے سامنے جو فضا تھی اس کا

کوئی افق نہیں تھا، کوئی سمت نہیں تھی، کوئی منزل نہیں تھی اور پھر اس نے سوچا کہ اگر یہ عدم سے عدم تک کا سفر کبھی بھی ختم نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا۔

اس موقع پر اس نے چیخ ماری ''تم نے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا ہے؟''

ایک ایر ہوسٹس جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور جو اس سے پہلے بھی صفدر سے بات چیت کر چکی تھی۔ اس کے پاس آئی اور شانوں کو جھنجھوڑا۔ صفدر کی کھوئی ہوئی بصارت آہستہ آہستہ واپس آنے لگی اور اس نے کہا ''تم نے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا تھا؟''

''ہم نے تو تمہیں تنہا نہیں چھوڑا تھا'' اس نے سادگی سے کہا۔

''تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ٹورانٹو۔ آپ وہیں رہتے ہیں نا۔ ہم گھر جا رہے ہیں شاید آپ نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ ٹھہریے میں آپ کے لئے ایک مشروب لے کر آتی ہوں''

جب ایر ہوسٹس چلی گئی تو وہ ایک دفعہ پھر اپنے ذاتی تجربے کی طرف لوٹ گیا اور خود کلامی میں مشغول ہو گیا'' تو یہ تھا جو پاسکال نے محسوس کیا تھا۔ جدید فضا کا خوف۔ سائنس نے خدا کے بازوؤں میں محفوظ کائنات کو ایک بے معنی، پرخطر، نہ ختم ہونے والے سفر پر بدل دیا تھا، جہاں انسان ڈراؤنے خواب میں کھو جاتا ہے''

ایر ہوسٹس لوٹی تو اس نے صفدر کو مشروب پیش کیا ''اسے پئیں گے تو بہتر محسوس کریں گے''۔

اس نے گلاس سے ایک گھونٹ پیا۔ اپنی شرمندگی چھپانے کیلئے اس کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مسٹر پاسکال سے کہیں کہ دوسری فضا میں سفر کرے۔ بادلوں سے اوپر کی فضا میں جہاں ہم نیلے آسمان کو دیکھ سکیں''

''مسٹر پاسکال کون ہیں'' ایر ہوسٹس نے نرمی سے پوچھا

''پائلٹ۔ کیا یہ ان کا نام نہیں ہے؟''

''نہیں۔ پائلٹ تو کیپٹن جونسن ہیں''

چونکہ وہ پریشان نظر آرہی تھی۔ وہ فوراً بولا ''معاف کیجئے گا میں مذاق کررہا تھا''

''ویسے پاسکال ہیں کون؟'' وہ اب متجسس تھی

''اوہ پاسکال۔ وہ سترھویں صدی میں فرانس میں رہتا تھا۔ وہ پہلا انسان تھا جس نے سیکولر فضا اور کائنات کو دریافت کیا تھا''۔

''سیکولر فضا'' ایر ہوسٹس کے چہرے پر گھبراہٹ کے سائے پھیل گئے۔

''اس فضا میں خوف کا ڈیرا بسیرا ہے اور دوسری فضا ممتا کی فضا ہے''

''اوہ'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی

''ممتا کے پکوان کی طرح''

''بالکل درست'' اور وہ دونوں ہنس دیے

''آپ مزاحیہ انسان ہیں مسٹر بیگ''

''شاید میں ہوں''

جانے سے پہلے ایر ہوسٹس نے نرمی سے اس کی شانے کو تھپتھپایا اور کہا ''اگلی دفعہ جب ہم بادلوں میں داخل ہوں گے۔ تو میں آپ کیلئے پہلے سے ہی ایک مشروب بنا لاؤں گی''

''یہ بہت عمدہ خیال ہے'' اس نے جواب دیا۔

ستمبر ۱۹۹۳ء

اپنے دور
کے
یوسف
کی ماں

وہ سارا دن اپنے گھر کی چھت پر بیٹھی دھوپ سینکتی رہتی اور عالم غنودگی میں خواب دیکھتی رہتی۔ اس کے خواب ان پھولوں کی طرح تھے جو وقت سے پہلے مرجھا گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی بینائی دن کے وقت خواب دیکھنے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی اور اسے ڈر تھا کہ یعقوب کی طرح وہ بھی اپنے بیٹے کے انتظار میں آنکھیں گنوا بیٹھے گی پھر تو اس کا بیٹا لوٹ کر آیا بھی تو وہ اسے چھو تو سکے گی دیکھ نہ سکے گی۔

اس کی آنکھوں کے نور کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کی توانائی بھی کم ہوتی جا رہی تھی البتہ اس کے سر میں چاندی اور جوڑوں میں درد بڑھتا جا رہا تھا اس کی خوراک اس کے خوابوں کی طرح بے رنگ اور بے مزہ ہو گئی تھی اگر وہ نمک کھاتی تو بلڈ پریشر اور چینی کھاتی تو Diabetes کے بدتر ہونے کا خطرہ تھا۔

وہ اپنے خاوند سے اپنے دکھوں کا ذکر کرتی تو وہ اسے ذکر الٰہی کی تبلیغ اور خدا سے لو لگانے کی تلقین کرتا۔ اس کا کہنا تھا ''بچے خدا کی امانت ہوتے ہیں وہ جب چاہے دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔ ہمیں بچوں سے زیادہ

امیدیں نہیں رکھنی چاہئیں''

اس نے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔

نہ کسی کی شادی میں، نہ سالگرہ میں، نہ کسی کی پیدائش پر، نہ موت پر، وہ کنج تنہائی میں بیٹھی آنسو بہاتی رہتی۔ آخری دفعہ وہ جس محفل میں شامل ہوئی تھی اس کے رنج وہ اکثر چاٹا کرتی۔ اس نے مختلف عورتوں کی باتیں سن لی تھیں۔

یہ بے چاری وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی ہے۔

تیسری دنیا کی نجانے کتنی عورتیں ایسی ہیں جن کی جوانیاں قبل از وقت ڈھل جاتی ہیں۔

اس کی جسمانی بیماریوں نے اس کے بال سفید کر دیے ہیں۔

وہ اور اس کا شوہر ایک گھر میں رہ کر بھی دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔

اسے اس کے بیٹے کی جدائی کھا گئی ہے۔

اور وہ محفل سے اٹھ کر چلی آئی تھی اور سارا راستہ اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرتی رہی تھی ''اگر میرا بیٹا میرے پاس ہوتا تو میرے زخموں پر مرہم رکھتا'' لیکن پھر وہ سوچتی ''وہ جب میرے پاس بھی تھا۔ تب بھی اسے شاعری اور افسانوں سے کہاں فرصت ملتی تھی کہ میرے جی کی بپتا سنے۔ اسے تو اپنے دوست، اپنے رشتہ داروں سے زیادہ عزیز تھے۔ لیکن اس کے دوستوں میں سے ایک شاعر دوست اس کی غیر موجودگی میں بھی حال پوچھنے آتا۔

''خالہ جان مزاج کیسے ہیں اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔''

''بیٹا! میں تمہیں اپنے بیٹے سے زیادہ ملتی ہوں۔ تمہاری ماں کتنی خوش قسمت ہے۔ میرا بیٹا تمہاری طرح اپنے خاندان کے ساتھ کیوں نہیں رہتا''

''خالہ جان! میں ایک معمولی شاعر ہوں۔ صرف اپنے خاندان کا خیال رکھتا ہوں آپ کا بیٹا ایک غیر معمولی انسان ہے اس نے ساری انسانیت کو اپنا

خاندان بنالیا ہے۔ آپ کو اپنے بیٹے پر اس طرح فخر ہونا چاہیے جس طرح اس کے دوست اس پر فخر کرتے ہیں''۔

''بیٹا! ہم ایک دوسرے کی زبان بھی تو نہیں سمجھتے۔ جب اسے بات کرنی نہ آتی تھی تب تو میں اس کی ہر بات سمجھتی تھی لیکن جب اس نے شعر کہنے شروع کر دیے تو ہمارے درمیان خلیجیں حائل ہوگئیں''

''خالہ جان! میری ماں بھی اور سبھی شاعروں کی مائیں بھی یہی کہتی ہیں''

''لیکن بیٹا! میں تو اس کی جدائی میں ہی مر جاؤں گی''اور اسے اپنے بیٹے کی نظم ''وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا''یاد آجاتی اور اس کے دل میں ایک زور سے ٹیس اٹھتی۔

وہ ہر جمعرات کو داتا دربار جا کر خیرات کرتی اور سال میں ایک دفعہ کالا بکرا ذبح کراتی تاکہ اس کا یوسف، اس کا شاعر بیٹا، نظر بد سے بچا رہے۔

''آپ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں'' نجانے کتنے رشتہ داروں نے پوچھا تھا۔

''وہ خود ہی نہیں کرنا چاہتا''وہ مختصر سا جواب دے کر موضوع بدل دیتی۔

وہ تھا بھی تو ایک خوبرو جوان۔ نوجوانی سے ہی شہر کی نجانے کتنی زلیخائیں اس کے آگے پیچھے ہوتی رہتیں۔ اس کا دامن ہمیشہ پھٹا رہتا کبھی آگے سے، کبھی پیچھے سے۔ نجانے کتنی ماؤں نے اس کی تصویریں دیکھ کر اسے اپنا داماد بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن جو لوگ اسے قریب سے جانتے تھے وہ کہتے تھے کہ وہ روایتی رشتوں پر ایمان نہیں رکھتا۔

اس کی عاشقی اور اس کی شاعری کے قصے تو کالج کے زمانے سے ہی مشہور ہو گئے تھے۔ اس کی پہلی نظم ''ایک اجنبی محبوبہ کے نام'' چھپی تھی جس میں اس نے ملک و مذہب، رنگ و نسل کے سب بت پاش پاش کر دیے تھے۔ اس کا پہلا افسانہ ''ایک بوسہ'' چھپا تو پوری یونیورسٹی میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں

اس نے اپنے فن پاروں میں، مردوں اور عورتوں میں نئے رشتے استوار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ فرسودہ روایات اور ان کے انسانی رشتوں پر آسیب کے سایوں سے تنگ آچکا تھا۔ وہ منافقت اور استحصال کے حصار کو توڑ کر ایک آزاد فضا میں سانس لینا چاہتا تھا، ایسی آزاد فضا جس میں شبِ وصل حلال اور شبِ فراق حرام قرار دی جائے گی۔ زمانۂ طالب علمی میں منٹو، فراز اور فیض کی کتابیں اس کے سرہانے تلے پڑی رہتیں۔ اصحاب نظر کا خیال تھا کہ وہ غلط ملک میں پیدا ہو گیا تھا ان کا خیال تھا کہ جب اس کے جوہر نمایاں ہوں گے تو یا تو وہ بہت مشہور ہو گا یا بہت بدنام۔

''بیٹا! تم عورتوں سے دور رہا کرو وہ تم پر جادو کر دیں گی'' اس کی ماں اسے نصیحت کرتی اور اس کا باپ جو اقبالؔ کا بہت عاشق تھا جب یہ شعر گنگناتا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نگار

آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

تو وہ منٹو کی زبان میں کہتا کہ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گنگتے ہیں اور گھوڑے گھوڑیوں کو دیکھ کر ہنہناتے ہیں تو اگر مرد، عورتوں کو دیکھ کر غزلیں یا افسانے لکھتے ہیں تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔

لیکن ایک دن اس کا اس ماحول میں اتنا دم گھٹنے لگا کہ اس نے چند کتابیں اور چند کپڑے اٹھائے اور گھر سے رخصت ہونے لگا ''ماں جی! میں دنیا کی سیر کرنے جا رہا ہوں اپنے آپ کو تلاش کرنے۔''

''بیٹا واپس کب آؤ گے''

''ماں جی! زندگی کے راستے یک طرفہ ہیں ان پر U-Turn نہیں بنائے جا سکتے۔''

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے تھے اور ان بیس برسوں میں اس ماں کے لئے ہر روز، سال اور ہر رات، صدی بن کر گزری تھی۔ ان بیس برسوں

میں وہ ایک رات بھی آرام اور سکون کی نیند نہ سوئی تھی وہ اکثر اوقات بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔ ان بیس برسوں میں اس کے خط آئے، نظمیں آئیں، افسانے آئے، اخباروں کے مضامین آئے۔ لیکن وہ خود نہ آیا۔

اس کا ایک شاعر دوست آکر خیر خیریت پوچھ لیتا۔ وہ اپنے بیٹے کے دوست سے پوچھتی ''میرا بیٹا کرتا کیا ہے''

''وہ نفسیات کا طالب علم ہے وہ لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیریں بتاتا ہے''

''لیکن اس دوران اس کی ماں کے سنہرے خواب ڈراؤنے خواب بنتے جارہے ہیں''

''خالہ جان! فکر نہ کریں۔ آپ کا بیٹا ایک دن بہت بڑا شاعر بنے گا''

''نہیں بیٹا! شاعروں کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اس دنیا میں شاعری اور خوابوں کی کوئی قیمت نہیں۔ غالب اتنا بڑا شاعر تھا لیکن عمر بھر قرض کی شراب پیتا رہا''

ان کے قریب ہی جائے نماز پر بیٹھا باپ اپنے بیٹے کو لکھ رہا تھا کہ بیٹا شاعروں کے کلام کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار کلام ربانی بھی پڑھ لیا کرو آخر ایک دن اس کے بیٹے کا دوست ہزار ہزار روپے کے پندرہ نوٹ دے گیا۔

''خالہ جان! پبلشر نے یہ رقم بھیجی ہے۔ کہتا ہے آپ کے بیٹے کی کتابیں بکنے لگی ہیں''

''بہت بہت شکریہ بیٹا! آؤ منہ میٹھا کرو۔ کچھ لڈو کھاؤ اور یہ چھوہارے ساتھ لے جاؤ۔ یہ میں نے قرآن ختم کرنے کے بعد دم کر کے رکھے ہیں''

اور اس نے ایک ہزار روپے کے دو کالے بکرے داتا دربار کی خدمت میں پیش کر دیے تھے اور باقی چودہ ہزار روپے سے گھر کی چھت پر دو کمرے بنانے شروع کر دیے تھے۔ جب پہلا کمرہ تیار ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹے

کی تصویر دیوار پر ایک طرف آویزاں کر دی۔

''درمیان میں کیوں نہیں لگاتیں'' کسی نے مشورہ دیا تھا

''کیوں کہ دوسری طرف اس کی دلہن کی تصویر لگے گی''

''لیکن وہ تو شادی نہیں کرنا چاہتا''

''ایک دن تو کرے گا ہی۔ جب شاعری کا بھوت اس کے سر سے اتر جائے گا''

اور ایک دن وہ آدھی رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے''

''کیا''

''میرا بیٹا خون میں لت پت ہے''

''سو جاؤ بھلی عورت آدھی رات ہے'

''نہیں نہیں''

اور وہ اپنے خاوند کو لے کر آدھی رات کو تار گھر گئی تھی۔ انہوں نے پہلے فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جب کسی نے فون نہ اٹھایا تو انہوں نے تار دیا تھا۔

اگلی شام کو اس کے بیٹے کا دوست بری خبر لے کر آیا تھا۔

''آپ کا بیٹا کار کے حادثے کا شکار ہو گیا ہے وہ ہسپتال میں ہے''

اس کی ماں دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ چند گھنٹوں میں کئی سال اور بوڑھی ہو گئی تھی۔

پولیس نے کار کا معائنہ کیا تھا۔ وہ ٹرک سے ٹکرا کر بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ صرف کار کی نمبر پلیٹ بچی تھی جس پر لکھا تھا Luving۔ سارے رشتہ دار جمع ہو گئے تھے۔ اگلے تار میں لکھا تھا کہ اس کے بیٹے نے ہسپتال میں جان دے دی تھی۔

اس کی ماں نے اس کی قبر کا انتظام کیا۔ وہ ہمیشہ اپنی نانی اماں کے بہت

قریب تھا اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ اسے اس کی نانی کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔

وہ دو دن تک آنسو بہاتی رہی اس کا خاوند قرآن پڑھ پڑھ کر اسے پھونکیں مارتا اور تسلیاں دیتا لیکن اسے کسی پل چین نہ آتا۔

آخر ایک اور تار آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کے بیٹے کی لاش کبھی نہیں آئے گی۔ حادثے کے بعد جب پولیس نے اس کے ڈرائیور لائسنس کا معائنہ کیا تھا تو اس میں اس نے لکھ رکھا تھا کہ اس نے اپنا جسم طب کے طالب علموں کو اور اپنی آنکھیں اور دل عورتوں کو تحفہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب سب رشتہ دار گھروں کو چلے گئے تو وہ آدھی رات کو اٹھ کر خاموشی سے قبرستان چلی گئی تھی اور اپنے بیٹے کی قبر کے پاس کافی دیر تک کھڑی رہی تھی اور پھر اس قبر میں اتر گئی تھی۔

بیس برس کے بعد وہ پہلی دفعہ سکون کی نیند سوئی تھی نجانے اس لئے کہ وہ اپنی ماں کی آغوش میں لیٹی تھی یا اس لئے کہ اسے یقین آگیا تھا کہ اس کا بیٹا اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا اور یا اسلئے کہ وہ بہت تھک چکی تھی۔

جولائی ۱۹۹۱ء

بحران

انسانیت کی اعلی اقدار

کے مالک

اپنے ابو اور چچا جان

کے نام

میں آج کل ایک ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہوں۔ نہ مجھے دن کو چین ملتا ہے نہ راتوں کو نیند آتی ہے۔

جب دوست احباب مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ

کیا عرفان صوفی بن گیا ہے یا وہ پاگل پن کا شکار ہو گیا ہے ؟

کیا اس نے معرفت حاصل کر لی ہے یا اس نے ذہنی توازن کھو دیا ہے ؟

تو میں خاموش ہو جاتی ہوں اور میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

جب میں اپنی ازدواجی زندگی اور عرفان کی شخصیت کے بارے میں غور کرتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ پچھلے سال تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زندگی کے اس موڑ پر کوئی اس قدر بدل سکتا ہے۔ ہمارا خاندان ایک خوشحال زندگی گزار رہا تھا اور میں یہ سمجھا کرتی تھی کہ میں عرفان کو اس سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں لیکن ایک انہونی بات ہو گئی اور وہ اتنا بدل گیا کہ اس کے ساتھ رہنا سوہان روح ہو گیا۔ کئی مہینوں کی اذیتوں اور رت جگوں کے بعد میں نے جب بھی سوچا کہ اس سے پہلے کہ میں اس سے نفرت کرنے لگوں، کیوں

نہ میں اٹھائیس برس کی شادی شدہ زندگی کی خوشگوار یادوں کو لے کر کہیں اور چلی جاؤں۔ عرفان کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ پچھلے چند مہینوں میں میں نے اتنے مصائب اور اتنی آزمائشوں کا سامنا کیا ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے صبر کا پیمانہ کسی لمحے ہی چھلک پڑے گا۔

کبھی کبھار میں اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں کہ اگر ہم کینیڈا نہ آئے ہوتے تو کیا ہمارا یہی حشر ہوتا۔

مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جب سعدیہ کو MC Master University سے خط آیا تھا کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہے۔ اس نے اپنے ابو کو فون کر کے یہ خوشخبری سنائی تو انہیں اتنی مسرت ہوئی کہ وہ اس سہ پہر چھٹی سے پہلے ہی شمپین کی بوتل لئے گھر آگئے اور خوشی سے ناچنے لگے۔ سعدیہ نے کبھی اپنے ابو کو اس طرح وفورِ جذبات سے رقص کرتے نہ دیکھا تھا۔ وہ بہت حیران ہوئی۔ عرفان نے مشورہ دیا کہ ہم سعدیہ کے لئے ایک پارٹی کا انتظام کریں۔ میں نے کیلی فورنیا فون کر کے عدیل کو دعوت دی تو وہ کہنے لگا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ جوئین کو بھی ساتھ لے کر آئے گا۔ عرفان اور میں یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے تھے کیونکہ ہم نے جوئین کے بارے میں سن تو بہت کچھ رکھا تھا لیکن اس سے ملے نہ تھے۔ میں نے سعدیہ سے کہا کہ وہ بھی اس خاص موقع پر اپنے بوائے فرینڈ من موہن کو دعوت دے کیونکہ اس سے بھی ہماری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ من موہن ہملٹن میں رہتا تھا اور اس کے پاس کار نہ تھی اس لئے سعدیہ ہی اس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ سعدیہ کی میک ماسٹر یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ من موہن کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکے۔ منموہن اس یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کا طالب علم تھا۔ اس شام جب میں اور عرفان کھانے سے فارغ ہو کر گپ شپ لگانے لگے تو عرفان نے اس ناچتے مور کی تصویر کا ذکر چھیڑا جو نجانے کب سے اس کے دفتر کی دیوار پر لٹک رہی تھی۔ یہ وہ تصویر تھی جو اس

کے والد نے اسے پاکستان سے رخصت ہوتے وقت تحفتاً دی تھی۔ عرفان نے اپنے والد کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے وہ تصویر دیوار پر لٹکا تو دی تھی لیکن کبھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا نہ تھا لیکن جب سعدیہ کا فون آیا تھا تو وہ خوشی سے اپنے دفتر میں ناچنے لگا تھا۔ اس دن اس نے اردو کے پرانے فلمی نغمے گنگنائے تھے اور طالبعلموں اور رفقاء کار کو لطیفے سنائے تھے اور اس سہ پہر جب وہ اپنے دفتر میں لوٹا تھا تو اس نے پہلی دفعہ اس تصویر میں مور کے چھوٹے سے سر، لمبی گردن اور پھیلے ہوئے خوبصورت پروں کو غور سے دیکھا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس مور کو ایک مجذوب کی طرح حال آ گیا ہو۔ اس دن خود عرفان خوشی سے اتنا بے حال ہو گیا تھا کہ اس کی سکریٹری نے یہ کہتے ہوئے کہ وہ کسی کام کا نہیں رہا اسے گھر بھیج دیا تھا۔

عرفان نے مجھے بتایا تھا کہ اپنی کالی Jaguar میں ٹورانٹو سے Whitby سفر کرتے ہوئے وہ کنیڈا میں گزاری ہوئی اپنی طویل زندگی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک وفادار بیوی، دو خوبصورت بچے، ایک کشادہ گھر جس میں سوئمنگ پول بھی تھا اور ٹینس کورٹ بھی، ایک کشتی جسکا نام ''کشتی نوح'' تھا اور ایک کاٹیج جو ''عرفان محل'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی کے ثبوت تھے۔ وہ مسرور تھا کہ اس کے دونوں بچوں کو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ جو ان کی اعلیٰ تعلیم کی ضمانت تھا۔ عرفان کو اپنی جان پہچان کے وہ ایشیائی مہاجر یاد آئے جو یونیورسٹی ڈگریاں رکھنے کے باوجود بے روزگار تھے ان کی خون پسینے کی کمائی ہوئی ڈگریاں کنیڈا میں کوڑیوں کے مول فروخت ہوتی تھیں اور وہ خاندانی مسائل کی وجہ سے برسوں سے پریشان تھے۔

عرفان نے اس شام اس بات کا اقرار کیا تھا کہ میری رفاقت کے بغیر اس کی زندگی نامکمل اور تشنہ رہتی اسے ہماری محبت پر بڑا ناز تھا۔ عرفان کی اس

گفتگو سے میں خوش بھی ہوئی تھی اور حیران بھی۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ عرفان مجھ سے اور بچوں سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے جذبات کی شدت کا مجھے اس شام پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا۔ اس نے جب میرے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا ''رفیقہ جانم! میں یہ سب کچھ تمہارے بغیر نہ کر سکتا تھا'' تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اب جو میں اس دن کے واقعات کے بارے میں سوچتی ہوں تو میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ جاتی ہے۔ اگرچہ عرفان کا رویہ اس شام غیر معمولی تھا لیکن میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ اپنی بیٹی کی کامیابی پر خوش تھا۔ اس دن مجھے بالکل خیال نہ آیا کہ وہ بظاہر مسکرا رہا تھا لیکن اس کا دل رو رہا تھا وہ اپنے قہقہوں سے اپنی بیٹی کی جدائی کے دکھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس خبر کے بعد اگلے دو ہفتے ہم نے پارٹی کی تیاریوں میں گزار دیے تھے۔ ہم نے کھانوں اور مہمانوں کی فہرستیں بنائیں۔ سعدیہ نے آلو گوبھی، بینگن بھرتہ، ملائی کوفتہ، میں نے کھیر، گاجر کا حلوا اور کیک اور عرفان نے بہاری اور چپل کباب بنانے کا وعدہ کیا۔ ان کبابوں سے عرفان نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کا دل موہ لیا تھا۔ وہ انہیں بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

وہ پارٹی نہایت کامیاب رہی۔ مہمانوں نے پہلے ٹینس کھیلا، پھر سوئمنگ پول میں نہائے اور پھر Bar BQ سے محفوظ ہوئے۔ عرفان نے مہمانوں کو نصرت فتح علی اور عزیز میاں کی قوالیاں سنوائیں۔ اب جو میں اس پارٹی کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے بہت سی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جنہیں اس وقت میں نے اہمیت نہ دی تھی۔ ہفتے کی شام کو جب ہم ڈنر کھانے بیٹھے تھے تو میز کے ایک کونے پر عرفان بیٹھا تھا اور دوسرے کونے پر میں۔ عرفان کے دائیں طرف سعدیہ اور من موہن بیٹھے تھے اور بائیں طرف عدیل اور جوئین۔ وہ ہمارے خاندان کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ ہم سب ایک ہی میز کے گرد جمع ہوئے تھے۔ ہماری جوئین اور منموہن سے ملاقات ہوئی تھی۔ عرفان نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا تھا

اور شفقت سے اپنے گھر میں خوش آمدید کہا تھا۔ کھانے کا آغاز لطیفوں سے ہوا تھا اور پھر گفتگو کا رخ سنجیدہ موضوعات کی طرف مڑ گیا تھا۔ جوئین نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اور عدیل فن اور پاگل پن کے رشتے پر تحقیق کر رہے تھے اور ان ادیبوں، فنکاروں اور موسیقاروں کے انٹرویو لے رہے تھے جو نفسیاتی مسائل اور ذہنی امراض کا شکار تھے۔ جوئین ان فنکاروں کے رشتہ داروں کا بھی انٹرویو لینا چاہتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ تخلیقی صلاحیتوں اور پاگل پن کی Genes مشترک ہوتی ہیں۔ اس نے Iceland کی ایک Research کا حوالہ دیا جس میں ماہرین نے یہ ثابت کیا تھا کہ دماغی توازن کھونے والے مریضوں کے خاندانوں میں، عام خاندانوں کی نسبت ادیبوں اور فنکاروں کی تعداد دو سے تین گنا زیادہ تھی۔ جوئین کے والدین خود بھی موسیقار تھے۔ سعدیہ نے مسکراتے ہوئے جوئین سے کہا تھا کہ وہ ہمارے خاندان کا بھی انٹرویو لے سکتی تھی کیونکہ عرفان کے بھائی ایک مشہور ادیب تھے اور ان کے چچا اپنی آخری عمر میں پاگل پن کا شکار ہو گئے تھے۔ عرفان نے ہنستے ہوئے کہا تھا ’’ہمارے خاندان پر بہت سے پیغمبری وقت آئے ہیں‘‘

کھانے کے دوران جب من موہن نے اپنے خاندان کا ذکر کیا تو عرفان سنجیدہ ہو گیا۔ من موہن نے ہمیں بتایا کہ اس کی والد مان تھی اور اس کا والد ہندو اور انہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام ہندوؤں والا رکھا جائے گا اور اگر ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا نام مسلمانوں جیسا ہوگا اسی لئے بیٹے کا نام من موہن اور بیٹی کا نام صائمہ بیگم رکھا گیا تھا۔ من موہن کی کہانی سن کر ہم سب محظوظ ہوئے تھے لیکن عرفان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ عرفان اس وقت کچھ اور بھی اکھڑ گیا تھا جب من موہن نے بتایا تھا کہ اس کا والد ابوالکلام آزاد کا قریبی دوست تھا اور آزاد پاکستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیوں سے بہت متاثر تھا۔ عرفان آخرکار اتنا بے چین ہوا کہ وہ

پہلے غسلخانے کا بہانہ کر کے اٹھا اور پھر سر درد کا بہانا کر کے خواب گاہ چلا گیا۔

اگلے دن عرفان حسب عادت ٹینس کھیل رہا تھا اور مہمانوں کو لطیفے سنا رہا تھا اس نے ٹینس کھیلنے کے لئے اپنی مخصوص ٹی شرٹ پہنی تھی جس پر لکھا تھا For Tennis Players Love Means Nothing مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کہ وہ سارا دن من موہن سے کتراتا رہا تھا اس نے جوئین کا تو مہمانوں سے تعارف کروایا تھا لیکن من موہن کو نظر انداز کر دیا تھا آخر میں نے خود من موہن کو سب دوستوں سے ملوایا تھا۔

اس رات جب سب مہمان چلے گئے تھے تو میں نے عرفان سے پوچھا تھا۔

''تم من موہن سے کترا کر کیوں نکل جاتے ہو۔ وہ تو تمہاری بہت عزت کرتا ہے''

عرفان چند لمحے خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ ''اس کی موجودگی میں مجھے الجھن سی ہوتی ہے۔''

اس ویکنڈ کے بعد عرفان نے دوبارہ من موہن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی میں نے اس کا ذکر چھیڑا۔ مجھے امید تھی کہ چند ملاقاتوں کے بعد وہ من موہن کا عادی ہو جائے گا اور اسے قبول کر لے گا۔ مجھے تو وہ بہت ہی اچھا لگا تھا وہ ایک مخلص اور ہمدرد انسان تھا اور سعدیہ کا بہت خیال رکھتا تھا۔

جس دن ہم سعدیہ کو میک ماسٹر یونیورسٹی چھوڑنے گئے اس دن من موہن ہمارا منتظر تھا۔ من موہن نے عرفان کو گلے لگانا چاہا لیکن عرفان نے صرف ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا۔ عرفان نے کسی قسم کی بے تکلفی کا اظہار نہیں کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس جانے پر اصرار کیا۔ واپسی کے سفر میں عرفان خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ وہ اداس دکھائی دے رہا تھا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ تمہیں کس بات کا غم ہے۔ سعدیہ کے یونیورسٹی جانے کا یا من موہن کے اپنانے کا؟''

عرفان نے چند لمحوں کے توقف کے بعد مختصر سا جواب دیا۔ ’’میں اس پر اعتماد نہیں کرتا۔‘‘

’’آخر اس نے ایسی کیا بات کی ہے کہ تم اس پر اعتماد نہیں کرتے‘‘

’’میرا دل نہیں مانتا‘‘

’’دل کی بات چھوڑو عرفان‘‘ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا ’’یہ تمہارا دل نہیں تمہارا تعصب، منافقت اور دوہرا معیار ہے۔ تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ تمہاری بیٹی ایک ہندو کے عشق میں گرفتار ہے اور عین ممکن ہے ایک دن اس سے شادی کرلے۔ تم چاہے کتنا کہتے رہو کہ تم ایک لبرل انسان ہو اور خدا پر ایمان نہیں رکھتے لیکن اگر تم اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکو تو تمہیں وہاں مذہب اور روایت کے بہت سے بت ملیں گے۔ تم جوئین سے مل کر خوش ہوئے تھے اور من موہن سے مل کر پریشان۔ اگر جوئین کے والدین بھی متعصب ہوتے اور عدیل سے ویسا ہی سلوک کرتے جیسے تم نے من موہن سے کیا ہے تو تمہیں کیسا لگتا۔‘‘
عرفان نے ایک کافی اور Donuts کی دکان کے سامنے گاڑی روک لی۔ کافی پینے کے دوران کہنے لگا۔

’’رفیقہ! تمہاری باتوں میں وزن ہے۔ دماغ تو مانتا ہے دل نہیں مانتا اور بعض دفعہ انسان اپنے جذبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا ہے، دلیلیں کام نہیں آتیں۔ میں کئی دنوں سے پریشان ہوں سوتک نہیں پایا‘‘۔

زندگی میں پہلی دفعہ عرفان نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ پریشان حال تھا۔ مجھے امید تھی کہ عرفان چند ملاقاتوں کے بعد منموہن کو قبول کرلے گا۔ میرا خیال تھا کہ عرفان کو اپنی بیٹی کے جدا ہونے کا دکھ بھی تھا اور ہم دونوں کے اکیلے رہ جانے کا غم بھی۔ اگلے چند ہفتے عرفان خاموش اور بجھا بجھا سا رہا۔ نہ تو وہ مسکراتا اور نہ ہی لطیفے سناتا۔ دن رات اپنے کام میں مصروف رہتا۔ میں بھی تنہائی سے مجبور سعدیہ کو ہر روز فون کرتی۔ وہ مجھے یاد آتی تھی۔ اپنا دل لگانے کے لئے

میں نے گھر کے باغ میں چند نئے پودے لگائے اور ان کی نگہداشت کے لئے چند کتابیں لا کر پڑھیں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے میں کچھ عرصے کے لئے مالی بن گئی۔ مٹی سے ہاتھ گندے کر کے مجھے بہت مزا آنے لگا تھا۔

اور پھر ایک دن بہت ہی بری خبر آئی۔ پاکستان سے فون آیا کہ عرفان کے والد کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ فوت ہو گئے۔ عرفان کے دل کو دھچکا لگا اور وہ کچھ اور ہی خاموش ہو گیا۔ اس نے یونیورسٹی سے چند دن کی چھٹی لے لی۔ ان سوگ کے دنوں میں نہ وہ ڈھنگ سے کھانا کھاتا، نہ کپڑے بدلتا، نہ نہاتا اور نہ ہی شیو کرتا۔ میں جب بھی اسے تسلی دینے کی کوشش کرتی وہ اٹھ کر چلا جاتا۔ میں بخوبی جانتی تھی کہ وہ اپنے والد کے بہت قریب تھا اور اسے اس بات کا دکھ تھا کہ وہ آخری دنوں میں اپنے والد سے نہ مل سکا تھا۔ آخر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ایک شام کھانے کے بعد عرفان نے خود ہی بات چیت شروع کی اور مجھے بچپن اور نوجوانی کے واقعات سنانے لگا۔ اور میں پوری توجہ سے سننے لگی۔

''میرے ابو اصولوں کے بہت پابند تھے۔ وہ اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر اور فلسفۂ حیات رکھتے تھے اور اس پر خلوص دل سے عمل کرتے تھے۔ مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا اور الیکشن میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ میں اپنی کلاس میں ہی نہیں پورے اسکول میں مقبول تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں صدارتی انتخاب جیت جاؤں گا۔ میرے قریبی دوست، میری بہت حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے انتخابات کے کاغذات حاصل کئے اور انہیں پر کیا۔ ان کاغذات میں لکھا تھا کہ مجھے ان پر اپنے والد سے بھی دستخط کروانے ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ابو ان کاغذات کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور میری مقبولیت پر فخر کریں گے۔ جب میں نے شام کو وہ کاغذات ابو جان کے سامنے پیش کئے تو پہلے تو وہ کچھ دیر سنجیدگی سے انہیں پڑھتے رہے پھر مجھ سے پوچھنے لگے۔''

"عرفان بیٹے! کیا تمہیں اسکول کے صدر بننے کی خواہش ہے"

"جی ہاں ابو جان"

"تو پھر تم بالکل اس کے مستحق نہیں"

"کیوں نہیں" میں ان کے جواب سے ہڑبڑا سا گیا تھا۔

"ہر وہ شخص جو خود صدر بننا چاہتا ہے، اس کا نام فہرست سے خارج کر دینا چاہیے۔ ایسے شخص سے یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کرے گا۔ ایک مخلص اور جمہوری نظام میں لوگ اپنی قیادت کے لئے خود اپنا صدر چنتے ہیں اور وہ صدر معذرت کرتا ہے کہ میں اس عہدے کو قبول کرنے کا اہل نہیں کیونکہ میں ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور وہ لوگوں کی بڑی منت سماجت کے بعد عہدہ قبول کرتا ہے۔"

عرفان بیٹا! میں تمہارے کاغذات پر دستخط نہیں کروں گا۔

اپنے ابو کا حتمی فیصلہ سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا اور میں وقتی طور پر ناامید بھی ہوا لیکن برسوں بعد مجھے ان کے فیصلے کی دانائی کا اندازہ ہوا۔

مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ ایک درویش بن گئے تھے اور انہوں نے تصوف کا راستہ اختیار کر لیا تھا میری شدید خواہش تھی کہ میں ان سے جا کر ملتا۔

مرنے سے چند ہفتے پیشتر ابو جان نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے مجھے اپنی بصیرتوں کے تحفوں سے نوازا تھا۔ وہ خط سادہ لیکن بہت پر اثر تھا۔ وہ خط مجھے عمر بھر عزیز رہے گا۔

"انہوں نے خط میں کیا لکھا تھا؟" میں متجسس تھی

"انہوں نے تحریر کیا تھا کہ سچائی کو پانے کے تین راستے ہیں:

عقل کا راستہ۔ جو سائنسدان اختیار کرتے ہیں

وجدان کا راستہ۔ جو صوفی اختیار کرتے ہیں اور

جمالیات کا راستہ۔ جو فنکار اختیار کرتے ہیں
اگر وہ سب مخلص ہوں تو سائنس دانوں، صوفیوں اور فنکاروں میں
کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیئے۔
ابو نہایت دانا شخص تھے۔

یہ کہانیاں سنانے کے بعد عرفان زار و قطار رونے لگا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ میں نے تسلی دینے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔

اپنے والد کی وفات کے بعد عرفان جب پہلے دن یونیورسٹی گیا تھا تو اس نے Jeans پہنی ہوئی تھی اور Shave بھی نہ کیا تھا۔ اس شام جب وہ واپس آیا تو اس نے ایک دفعہ پھر اپنے دفتر کی دیوار پر لٹکی مور کی تصویر کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ اس نے اس سہ پہر مور کے بدصورت پاؤں کو غور سے دیکھا تھا اور اسے اپنے ابو کی بات یاد آئی تھی۔ جنہوں نے کہا تھا کہ اگرچہ مور جنگل کا خوبصورت ترین جانور تھا لیکن قدرت نے اسے بدصورت پاؤں اس لئے دیے تھے تاکہ وہ مغرور نہ ہو جائے اور عاجزی کا لبادہ نہ اتار پھینکے۔

جب میں نے عرفان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کچھ عرصے کے لئے پاکستان کیوں نہیں چلا جاتا تو وہ کہنے لگا کہ اگلے چند ہفتوں میں اس کے تین طلباء کے امتحانات تھے اور وہ محنتوں میں سے ایک تھا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ جہلم پر چلا جائے گا لیکن سفر کی رقم سعدیہ کو دے دی تاکہ وہ ایک کانفرنس میں شریک ہو سکے۔ جب میں نے عرفان سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگا ''دیار غیر میں رہنے کی مہاجروں کو کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے''۔ اور پھر عرفان کی سلیم سے دوستی ہو گئی جو ٹورانٹو یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا پروفیسر تھا اور روحانیت پر تحقیق کر رہا تھا۔ سلیم نے عرفان کو بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں جن میں سے

چند ایک صوفیاء کی زندگی کے بارے میں تھیں۔

ایک دن جب عرفان نے مجھے بتایا کہ وہ سلیم کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے جا رہا ہے تو میں بہت حیران ہوئی اور پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ''عرفان! جب سے ہم کینیڈا آئے ہیں تم کبھی عید کی نماز پڑھنے نہیں گئے، اب کیوں جا رہے ہو۔ تم تو لوگوں کو یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ تم خدا پر اور نہ ہی آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہو۔'' عرفان کہنے لگا کہ سلیم نے اسے قائل کر لیا ہے کہ اسے عید کی نماز میں مذہبی نہیں سماجی اور تہذیبی وجوہات کی بنا پر شریک ہونا چاہیے۔

اب جو میں اس عید کی نماز کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ عرفان کی سوچ کی تبدیلی میں اس نماز کے خطبے نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس مقرر نے عرفان کا دل موہ لیا تھا۔ اور ایک آسانی سے متاثر نہ ہونے والے شخص کو بہت متاثر کیا تھا۔ عرفان ہفتوں اس خطبے کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اسے اس تقریر کے کئی حصے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ مجھے عرفان کی باتیں تفصیل سے تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ مقرر نے خطبے میں کہا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں جو دو طرح کے نقطۂ نظر اور طرزِ حیات رکھتے ہیں۔

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو حریص ہیں۔ وہ عمر بھر دوسروں سے چیزیں مانگتے اور جمع کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ گھر بناتے ہیں۔ کاریں اور کشتیاں خریدتے ہیں، کاٹیج بناتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ یہ چیزیں انہیں خوشیاں مہیا کریں گی لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں ہوتے کیونکہ وہ لالچی ہوتے ہیں۔ اگر ان کے پاس ایک لاکھ ڈالر آ جائیں تو وہ دوسرے لاکھ کے غم میں بھٹکتے رہتے ہیں اگر وہ ایک گھر اور ایک کار کے مالک بن جائیں تو بچوں کے لئے دوسرے گھر اور کار کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ گلاس کے اس حصے کو دیکھتے ہیں جو آدھا خالی ہوتا ہے اور پریشان رہتے ہیں۔

اس گروہ کے مقابلے میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو قناعت کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ چیزیں جمع کرنے کی بجائے اپنی ذات کی تربیت اور شخصیت کی نشوونما پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان کی قناعت انہیں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور سکون فراہم کرتی ہے۔ وہ لوگ حریص ہونے کی بجائے سخی ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں سے لینے کی بجائے اہل حاجت کو دینے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ گلاس کے اس حصے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو بھرا ہوا ہوتا ہے اور پرسکون اور خوش زندگی گزارتے ہیں۔

عرفان کا خیال تھا کہ مغربی دنیا کے لوگ سرمایہ دارانہ طرز حیات کی وجہ سے زیادہ حریص ہو گئے تھے جب کہ مشرقی لوگ اپنی روحانی اور مذہبی روایات کی وجہ سے زیادہ قانع تھے لیکن وہ مشرقی لوگ جو مغرب میں آ بسے تھے ان کی آنکھیں خوبصورت گھروں، لمبی کاروں اور بلند و بالا بینکوں کی روشنی دیکھ کر چوندھیا گئی تھیں۔ انہوں نے ڈالروں سے تو اپنی جیبیں اور بینک بیلنس بھر لئے تھے لیکن اپنے دل کا سکون کھو دیا تھا وہ مالدار ہو کر بھی پریشان حال تھے۔

عرفان کو اس عید کی تقریر میں سب سے زیادہ ایک لوک کہانی پسند آئی تھی جو بادشاہ کے بارے میں تھی۔

ایک دن ایک بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کرنے نکل جاتا ہے۔ جنگل میں جب اسے ایک خوبصورت ہرن نظر آتا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ تم یہیں رک جاؤ۔ میں اکیلا اس کا شکار کرنے جاؤں گا۔ بادشاہ اپنا گھوڑا اس ہرن کے پیچھے سرپٹ دوڑانا شروع کر دیتا ہے۔ کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد ہرن تو اس کے ہاتھ نہیں آتا وہ خود بھی کھو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے وہ بھوک پیاس کا مارا اپنے ساتھیوں کی تلاش کرتا پھرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ وہ جنگلی جانوروں سے بھی ڈرتا رہتا ہے کہ وہ کہیں اسے مار نہ ڈالیں۔ پیاس سے اس کا برا حال ہو جاتا ہے۔ آخر اسے ایک کٹیا

نظر آتی ہے جہاں ایک درویش اپنی عبادت میں مصروف ہوتا ہے۔ بادشاہ اس درویش کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور پانی کے ایک گلاس کی درخواست کرتا ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر درویش مسکراتا ہے اور کہتا ہے۔

"ہر چیز کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے"

"کس قدر؟"

"آدھی بادشاہت" اور وہ درویش، بادشاہ کو ایک کاغذ اور قلم پیش کرتا ہے۔ بادشاہ چند لمحے سوچتا ہے اور پھر آدھی بادشاہت لکھ کر دے دیتا ہے۔ درویش اپنے مٹکے میں سے پانی کا ایک گلاس نکال کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ بادشاہ پانی پی کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد بادشاہ کو ساتھی تو ملتے نہیں۔ اس کے پیٹ میں سخت درد شروع ہو جاتا ہے اور پیشاب بند ہو جاتا ہے۔ بادشاہ بہت گھبراتا ہے اور دوبارہ درویش کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔

بادشاہ درویش سے اپنی تکلیف بیان کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔

"میں مدد تو کر سکتا ہوں" درویش شفقت بھرے لہجے میں کہتا ہے

"لیکن ہر چیز کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے"

"کس قدر؟" بادشاہ پوچھتا ہے۔

"آدھی بادشاہت" اور اسے دوبارہ وہی کاغذ اور قلم پیش کرتا ہے

بادشاہ چند لمحے سوچتا ہے اور اسے بقیہ آدھی بادشاہت بھی لکھ کر دے دیتا ہے۔

درویش، بادشاہ کو چند جڑی بوٹیاں اور پانی کا ایک گلاس پیش کرتا ہے اور پھر اسے لیٹ جانے کو کہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ کی طبیعت بحال ہو جاتی ہے اور وہ پیشاب کر لیتا ہے۔

بادشاہ درویش کا شکریہ ادا کرتا ہے

جب بادشاہ رخصت ہونے لگتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ درویش کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر اس نے دستخط کئے تھے اپنی کٹیا کے باہر جلتی آگ میں پھینک دیتا ہے۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

''تم حیران کیوں ہو؟'' درویش پوچھتا ہے

''یہ میری ساری بادشاہت ہے''

''جس کی قیمت صرف پانی کا ایک گلاس ہے'' اور درویش مسکراتا ہے۔

ایک دفعہ عرفان ساری رات سو نہ پایا تھا اور عید کی تقریر کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ خود ہی حیران تھا کہ اس تقریر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس مقرر کے الفاظ ''زندگی میں خلا'' اور ''روحانی تشنگی'' بار بار اس کے دل پر کچوکے لگاتے رہے تھے۔ وہ انکے بارے میں سوچتا تو اس پر رقت کا سا سماں طاری ہو جاتا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک روحانی خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے دامن میں زندگی کی سب نعمتیں تو موجود تھیں لیکن وہ ذہنی اور قلبی سکون کی دولت سے محروم تھا وہ خود سے پوچھنے لگا تھا کہ کیا کینیڈا آنا ایک سراب کا پیچھا کرنا تو نہیں تھا۔

اگلے دن عرفان نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلی رات کروٹیں بدلتے ہوئے پہلی دفعہ اس کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ مجھے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے میں اس کا مستحق نہیں ہوں اور اس خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

جب کافی دیر تک اسے نیند نہ آئی تھی تو اس نے اپنی والدہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جنہوں نے اسے پاکستان سے جاتے وقت ایک قرآن مجید تحفے میں دیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا تا کہ اپنی والدہ کا قرآنی نسخہ تلاش کر سکے۔

''کون ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا تھا کیونکہ میں آدھی رات کو ساتھ والے کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر گھبرا گئی تھی۔

''میں ہوں'' میں عرفان کی آواز سن کر حیران ہوئی تھی۔

''تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ میں سمجھی گھر میں چور گھس آئے ہیں''

''میں پرانے ٹرنک میں امی کا دیا ہوا قرآن مجید تلاش کر رہا ہوں''

''وہ وہاں نہیں ہے وہ بیسمنٹ کے کسی صندوق میں ہے۔ تم نے برسوں اسے پڑھا نہیں تو میں اسے سنبھال کر رکھ آئی''۔

عرفان واپس بستر میں آیا تو کہنے لگا ''جانم! میں نوکری سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں''

''خیریت تو ہے۔ کیا تم دیوانے ہو گئے ہو۔ آدھی رات کو تمہیں استعفیٰ دینے کی سوجھی ہے۔ سو جاؤ۔ خالی دماغ میں شیطان بستا ہے'' میں تو پہلو بدل کر سو گئی لیکن وہ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ شیطان ہے اور اس کا ذہن شیطانی خیالات سے بھر گیا ہے۔

عرفان تھک کر تھوڑی دیر کے لئے سویا تو ایک رومانوی خواب نے اسے جگا دیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ اپنی ایک خوبصورت فرنچ طالبہ سے ہمبستری کر رہا ہے۔ وہ طالبہ جس کے عشق میں آدھی یونیورسٹی مبتلا تھی اور سب عرفان کو رشک سے دیکھتے تھے کہ وہ طالبہ اس کی کلاس میں تھی۔

عرفان اٹھ کر غسل کرنے چلا گیا اور سوچنے لگا کہ وہ سو تو میرے ساتھ رہا تھا جس سے اس نے مہینوں ہم بستری نہ کی تھی اور خواب میں کسی اور دوشیزہ کو گلے لگا رہا تھا۔ نجانے کب سے وہ رات کی خبریں سننے کے بعد اتنی دیر سے بستر میں آتا تھا کہ میں اکثر اوقات سو چکی ہوتی تھی عرفان کو ندامت کا احساس ہونے لگا تھا۔

عرفان کو نوجوانی کا وہ دور بھی یاد آیا تھا۔ جب ہفتے میں کئی کئی بار اس پر غسل فرض ہو جاتا تھا اور وہ بہت پریشان رہتا تھا۔ نہ تو وہ گھر میں غسل کر سکتا تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ اعلان کرنا ہوتا تھا کہ اس نے ایک جنسی خواب دیکھا ہے

اور نہ ہی وہ مسجد جا کر نماز پڑھ سکتا تھا کیونکہ غسل کے بغیر نماز پڑھنا گناہ تھا چنانچہ کئی دفعہ اس نے بغیر غسل کے ہی نماز پڑھی تھی اور احساسِ گناہ میں نہا گیا تھا۔

اگلی صبح عرفان اتنا تھکا تھکا سا تھا کہ اس نے یونیورسٹی فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اتنا بیمار ہے کہ کام پر نہیں آسکتا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا تھا "میں احساسِ گناہ میں مبتلا ہوں"

"کس وجہ سے" میں نہیں جانتی تھی کہ اسے یونیورسٹی نہ جانے کا دکھ تھا یا مجھے رات بھر پریشان کرنے کا۔ "میں استعفیٰ دینا چاہتا ہوں"۔

"استعفیٰ دے کر کیا کرو گے۔ ریٹائیرڈ زندگی گزارو گے۔ ہمارے دونوں بچے اب یونیورسٹی میں ہیں اور انہیں مالی امداد کی ضرورت ہے۔"

میں یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی کیونکہ میں اس موضوع پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عرفان کے ساتھ اتنے سارے سال گزارنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کبھی کبھار وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا تھا اور ایسی باتیں کرنے لگتا تھا جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے سر پر جنوبی امریکہ جا کر رہنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا لیکن چند ہی ہفتوں کے بعد اسے خود ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ Spanish جانے بغیر وہ وہاں نہ رہ سکتا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد تھے جب اسے ہوائی جہاز اڑانے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ بھی جنون کی حد تک۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے ہوائی جہاز اڑانا سیکھ لیا تو وہ شمالی امریکہ میں کہیں بھی ویکنڈ پر اڑ کر جا سکتا تھا لیکن کئی مہینوں کی ٹریننگ اور ہزاروں ڈالر خرچ کرنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ Cessna Aero-Plane جس کی وہ ٹریننگ لے رہا تھا وہ Jaguar Car سے آہستہ چلتا تھا اور جہاز کا کار کی بہ نسبت موسم پر زیادہ انحصار تھا۔ ان حقائق کی آگاہی کے بعد وہ اس خواب سے بھی دستبردار ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر میں اسے شیخ چلی کہہ کر پکارتی تھی جو دن بھر بیٹھا ہوائی

محل تعمیر کرتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس نے ایک دفعہ پھر ہوائی محل تعمیر کرنے شروع کر دیے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماضی میں ہوائی محل خوشگوار ہوا کرتے تھے لیکن اس دفعہ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا اور سب سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔

جب عرفان کی طبیعت بہتر نہ ہوئی اور اس کا قرآن کا مطالعہ بڑھ گیا تو مجھے تشویش ہوئی۔ وہ اپنے گرد ایک دیوار تعمیر کر رہا تھا اور عقل کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ آخر میں نے اسے مشورہ دیا کہ ہم چند دنوں کے لئے اپنے Cottage چلے جائیں تاکہ وہاں وہ آرام کر سکے۔ ماضی میں جب بھی ہم پریشان ہوتے تو چند دن کی چھٹی سے ہماری طبیعت بحال ہو جاتی۔ کاٹیج میں نہ فون ہوتا نہ ٹی وی ہم جھیل کے کنارے سیر کرنے چلے جاتے اور فطری مناظر سے محظوظ ہوتے۔

عرفان نے میرا مشورہ مان لیا۔ اور کہنے لگا ''میں کاٹیج میں اپنے روحانی خلا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سکوں گا'' چنانچہ ہم اپنے شہر Whitby سے ایک گھنٹے شمال کی طرف Linosey چلے گئے۔ جہاں ہمارا کاٹیج تھا۔ کاٹیج جانے کا تجربہ ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔

پہلے دن عرفان نے آرام کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ دوسرے دن ان کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب میں کاٹیج کے آتشدان کے سامنے بیٹھی عرفان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ مجھے احساس تو تھا کہ عرفان کی طبیعت دن بدن بدتر ہوتی جا رہی ہے لیکن میں نے اس کا الزام اس کے والد کی موت اور اس کی ہائی بلڈ پریشر کی تشخیص پر لگایا تھا۔ ڈاکٹر نے عرفان کو بتایا تھا کہ اسے ایسی غذا کھانی چاہیے جس میں Cho-lesterol کم ہو۔ عرفان سے کہا گیا تھا کہ وہ انڈے، گوشت اور مرغن غذائیں کم کھائے۔ عرفان انڈے اور مرغن غذائیں تو چھوڑ سکتا تھا۔ گوشت نہیں، وہ کہا

کرتا تھا ''مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کا ایک فائدہ تو ہے کہ میں گوشت کھا سکتا ہوں۔ اگر ہندو گھرانے میں پیدا ہوتا تو کیا کرتا''

لیکن مجھے آہستہ آہستہ احساس ہو رہا تھا کہ عرفان کا مسئلہ زیادہ گھمبیر ہے۔ اس کی سوچ میں ایک ایسی شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی جو پہلے موجود نہ تھی۔ جب عرفان سیر سے واپس لوٹا تو پہلے تو اس نے ایک چیخ ماری اور پھر رفیقہ کہہ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس سے پہلے نہ تو وہ کبھی چیخا تھا اور نہ ہی اس نے مجھے ''رفیقہ'' کہہ کر پکارا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جانم! کہہ کر بلاتے تھے۔ میں نے ''اندر آجاؤ'' کہہ کر دروازہ کھولا اور اس کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گئی وہ پسینے میں شرابور تھا اور سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

''جانم! خیریت تو ہے'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''مجھ پر عذاب نازل ہوا ہے۔ میرا بایاں بازو اور ٹانگ مفلوج ہو گئے ہیں'' اور وہ اوورکوٹ اتارے بغیر کمرے میں یوں آگے پیچھے گھومنے لگا جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔

''جانم! تم ٹھیک ہو۔ مفلوج نہیں ہو'' میں نے اس کو تسلی دینی چاہی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

کمرے میں ایک قد آدم آئینہ تھا جس کے سامنے وہ تیز تیز چلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ ''میں پاپی ہوں۔ شیطان نے مجھ پر حملہ کیا ہے مجھ پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔'' میں آبدیدہ اسے تڑپتا دیکھتی رہی۔ میں بالکل بے بس تھی کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ آتشدان میں آگ سرد ہو رہی تھی۔

اس شام مجھے یقین ہو گیا تھا کہ عرفان اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہی تھی کہ میں نے سردیوں کے موسم میں کیوں کامبج آنے کا مشورہ دیا۔ ان دنوں ارد گرد کوئی نہ تھا اور قریب ترین اسٹور اور

فون دو میل دور تھے۔ میں عرفان کو اس حالت میں چھوڑ کر نہ جانا چاہتی تھی۔ آئینے کے سامنے ایک گھنٹہ تیز تیز چلنے کے بعد عرفان چند لمحوں کے لئے رکا۔ اس نے جلدی جلدی دو گلاس پانی پیئے اور پھر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک دفعہ پھر بڑبڑانے لگا۔ میں جہنم میں جل رہا ہوں۔''

وہ رات میری زندگی کی بدترین رات تھی۔ میں کھلی آنکھوں سے ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی تھی۔ میں ایک اجنبی دیس میں رہنے کا کرب برداشت کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ انسان کو اپنوں کی یاد اسی وقت شدت سے آتی ہے جب وہ کسی بحران کا شکار ہو۔

صبح پانچ بجے عرفان نڈھال ہو کر اوور کوٹ اور بوٹوں سمیت صوفے پر گرا اور سو گیا۔ میں دبے پاؤں کاٹیج سے باہر نکلی اور فون کی طرف بھاگی۔ میں کار نہ لے جا سکتی تھی کیونکہ اسکی چابی عرفان کے اوور کوٹ کی جیب میں تھی۔ دو میل کی دوڑ کے بعد میں فون تک پہنچی۔ میں نے آپریٹر کو اطلاع دی تو چند ہی منٹوں میں پولیس اور ایمبولنس میرے پاس پہنچ گئے۔

جب پولیس آفیسر خاتون نے مجھ سے حالت کی تفاصیل جاننی چاہی تو میں اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ میرے منہ سے کوئی بات ڈھنگ سے نکل ہی نہ رہی تھی۔ میں صرف اتنا کہہ سکی ''خاوند..... بیمار'' اور میری زبان گنگ ہو گئی۔ اس آفیسر نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مجھے تسلی دی۔ جب میری طبیعت قدرے سنبھلی، تو میں نے اسے حالات سمجھائے اور اپنے ساتھ کاٹیج لے آئی۔

جب میں کاٹیج میں داخل ہوئی تو عرفان صوفے پر موجود نہ تھا وہ Shower لے رہا تھا۔ میں نے اسے کپڑے بدل کر باہر آنے کو کہا۔ خوش قسمتی سے وہ میری بات مان گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایمبولنس بلائی ہے تاکہ وہ ہسپتال جا سکے۔ جونہی عرفان نے پولیس کو دیکھا وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے لگا۔

''دفعہ ہو جاؤ۔ میں گنہگار ہوں۔ میں ملعون ہوں۔

مجھ پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ دفعہ ہو جاؤ''

میں اس وقت بالکل بے بس تھی۔ میں اسے قائل نہ کر سکی کہ وہ اپنی مرضی سے ہسپتال جائے۔ آخر کار پولیس افسروں نے اسے زبردستی زمین پر گرا کر اور ہتھکڑیاں لگا کر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اسے Lindsey کے ہسپتال لے گئے۔

Duty Doctor نے اس کا معائنہ کیا، میرا انٹرویو لیا اور اسے بہتر گھنٹے کے لئے اس کی مرضی کے بغیر ہسپتال میں داخل کر دیا۔ نرسوں نے جب اسے زبردستی Chlorpromazine کا ٹیکہ لگایا تو اسے نیند پڑ گئی۔

عرفان کو ایک پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور ایک اسپیشل ڈیوٹی نرس اس کا خیال رکھنے لگی۔ میں نے پولیس آفیسرز اور ایمبولنس ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور وہ واپس چلے گئے۔

جب میں نے سعدیہ اور عدیل کو ان کے والد کی بیماری کی خبر دی تو وہ جتنا جلد ہو سکتا تھا ہسپتال پہنچ گئے۔ سعدیہ ہملٹن سے گاڑی میں اور عدیل کیلی فورنیا سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آ گیا۔ وہ دونوں اپنے والد کو ہسپتال میں دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عرفان اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور اس کا مشورہ تھا کہ اسے نفسیاتی مریضوں کے ہسپتال منتقل کر دیا جائے۔ مجھے پاگل خانے کے تصور سے ہی خوف آتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کینیڈین ڈاکٹر اس کے مرض کو نہ سمجھ سکیں گے اور اس کا صحیح طریقے سے علاج نہ کر پائیں گے۔

میں نے پاکستان فون کیا اور اپنے بھائی بہنوں سے مشورہ کیا۔ سارے خاندان کی متفقہ رائے یہ تھی کہ میں عرفان کو لے کر پاکستان آ جاؤں اور وہاں اس کا علاج کرواؤں۔ عرفان کا قریبی دوست ثاقب ساتھ چلنے کو تیار تھا تاکہ ہوائی جہاز میں عرفان کا خیال رکھ سکے۔ عدیل اور سعدیہ میرے اس فیصلے سے خوش نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عرفان کا کینیڈا کے ہسپتال میں بہتر علاج ہو سکتا تھا

لیکن انہوں نے مجھ پر دباؤ نہ ڈالا اور میرے فیصلے کا احترام کیا۔ جب میں نے عرفان کو پاکستان جانے کی خبر سنائی تو اس نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔

ثاقب دو دن عرفان کے ساتھ Lindsey کے ہسپتال میں رہا اور میں اپنے بچوں کے ساتھ Whitby چلی گئی تاکہ پاکستان جانے کی تیاری مکمل کر سکوں۔

اس رات جب میں اپنی خوابگاہ میں سونے کی کوشش کر رہی تھی تو برآمدے میں سعدیہ اور عدیل آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں سو چکی ہوں لیکن میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔

عدیل کہہ رہا تھا ''امی اور ابو کا جوڑ عجب بے ڈھنگا ہے۔ انہوں نے یوں تو ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا۔ اس لئے ہم انہیں تو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے لیکن خاندان کے بزرگوں نے نجانے کیا دیکھ اور سوچ کر انہیں یکجا کیا تھا۔ ان کا شاید خیال تھا کہ چونکہ دونوں کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا اور ان کا رہن سہن ایک جیسا تھا۔ اس لئے ان کے تعلقات خوشگوار رہیں گے۔ کیا انہیں اس بات کا احساس نہ تھا کہ دو انسانوں کے اکٹھے خوش رہنے کے لئے ایک جیسے کھانا کھانے اور کپڑے پہننے کے ساتھ ساتھ جذباتی اور نظریاتی ہم آہنگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے امی اور ابو دو مختلف دنیاؤں کے باشندے ہوں ان کے نقطۂ نظر اور نظریہ حیات میں کچھ بھی تو مشترک نہیں ہے۔ انکے خاندان اور انکی روایات بھی بالکل مختلف ہیں۔ امی کا خاندان روایتی، مذہبی اور حقیقت پسند ہے۔ ان کے رشتہ دار زیادہ تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ وہ خاندان کے مستقبل کے لئے اپنی ذاتی رائے اور حق قربان کر دیتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں ابو کا خاندان نہایت پڑھا لکھا، غیر روایتی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں وہ صرف فلسفی ہی نہیں تھوڑے سے دیوانے بھی ہیں''

سعدیہ کہنے لگی ”یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ”امی اپنے خاندان میں سب سے بڑی تھیں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ساری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر تھیں۔ وہ آہنی قوت ارادی کی مالک تھیں۔ جب کہ ابو اپنے گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی طبیعت میں کھلنڈرا پن بھی تھا اور بے نیازی بھی۔ وہ تاش، کیرم، ٹینس کھیل کر اور لطیفے سنا کر خوش ہوتے تھے۔ ان کی بڑی بہن زبیدہ نہایت سخت گیر عورت تھیں۔ شروع شروع میں تو امی جان اور زبیدہ پھو میں خوب ٹھنی تھی لیکن جب ابو نے پی ایچ ڈی پاس کر لیا اور کینیڈا چلے آئے تو وہ سرد جنگ ختم ہو گئی۔

امی اور ابو کا تو بالکل کوئی جوڑ ہی نہ تھا۔ بہت سے ایشیائی خاندانوں کی طرح ان کا ساتھ رہنے کا جواز ان کے بچے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے وہ آپس میں بندھے ہوئے تھے۔

اب جب کہ ہم گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں تو ان کا ساتھ رہنے کا جواز باقی نہیں رہا۔“

عدیل نے جب پوچھا ”تو کیا تمہارا خیال ہے کہ ابو کا پاگل پن کا دورہ شادی کے رشتے کو ختم کرنے کا بہانا ہے“ تو سعدیہ کہنے لگی ”پاگل پن کا دورہ Extra Marital Affair سے تو زیادہ قابل قبول ہے“

اپنے بچوں کی باتیں سن کر تو میری آنکھوں سے بچی کچی نیند بھی اڑ گئی۔

جب میں پاکستان میں تھی تو میرا عدیل اور سعدیہ سے ملنے کو اور باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا لیکن ہمارے گھر میں فون نہ تھا اور Telephone Exchange سے بات چیت کر کے تسلی نہ ہوتی۔ چنانچہ ایک دن میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی اور اپنے بچوں کو خط لکھنے لگی۔

پیارے عدیل اور عزیزہ سعدیہ!

تم دونوں کی یاد مجھے بہت ستاتی ہے۔ جب میں پاکستان آئی تھی تو میرا

خیال تھا کہ خاندان اور ڈاکٹروں کے علاج سے عرفان دو تین ہفتوں میں صحت یاب ہو جائے گا اور ہم واپس کنیڈا چلے جائیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہمیں پاکستان آئے اب چند مہینے ہو گئے ہیں۔

جب ہم پاکستان پہنچے تو عرفان کی حالت دیکھ کر سارے خاندان کو تشویش ہوئی۔ تمہارے محسن ماموں، حلیمہ اور سلیمہ خالہ اور صفیہ نانی نے مل کر عرفان کی تیمارداری کرنی شروع کی۔ ہم دن رات جاگتے رہتے اور اس کے علاج کی فکر میں رہتے لیکن ایک ہی ہفتے میں سب تھک ہار کر نڈھال ہو گئے چنانچہ اس کے بعد ہم نے چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی لگا دی۔ ایک رشتہ دار عرفان پر نگاہ رکھتا اور باقی آرام کرتے۔ پاکستان آکر عرفان کی پیاس بڑھ گئی تھی وہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد پانی کا ایک گلاس پیتا اور پھر اسی تیزی سے پیشاب کرتا۔ وہ دن بھر میں اتنا زیادہ پانی پی لیتا کہ کھانا بالکل نہ کھاتا۔ وہ دن میں دو تین دفعہ غسل بھی کرتا۔

پہلے تو ہم نے حلیمہ کے معالج ڈاکٹر سعید سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر محمود سے رجوع کرنے کو کہا۔ جو میڈیسن کے ماہر ہیں۔ ڈاکٹر محمود نے پوری کہانی سننے اور عرفان کا معائنہ کرنے کے بعد تشخیص کی کہ اسے Diabetes Insipidus کی تکلیف ہے اس کا Pitutary Gland متاثر ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے گردے اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کر رہے۔ انہوں نے خصوصی ہارمونز کے ٹیکے لگانے کا مشورہ دیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ ٹیکے نہ صرف بہت مہنگے تھے بلکہ پاکستان میں دستیاب بھی نہیں تھے۔ تمہارے محسن ماموں کا ایک دوست انگلستان میں رہتا تھا اس نے وعدہ کیا کہ وہ ٹیکے انگلستان سے خرید کر بھیج دے گا تاکہ عرفان کا علاج ہو سکے۔ ڈاکٹر محمود کا خیال تھا کہ اسی بیماری نے عرفان کو ذہنی طور پر بھی متاثر کر رکھا ہے لیکن انہوں نے پھر بھی چند مسکن ادویہ تجویز کیں تاکہ وہ رات کو آرام کی نیند سو سکے۔

پہلے دو ہفتے ہم ٹیکوں کا انتظار کرتے رہے اور اگلے دو ہفتے ٹیکے لگا کر

صحت یابی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب ان سے بھی کوئی شفا نہ ہوئی تو ہم بہت مایوس ہوئے اہلِ خانہ کے چہرے اتر گئے۔ انہیں اپنی محنت اور انتظار رائگاں جاتے نظر آئے۔

جب میرے قریبی رشتہ دار تیمارداری سے تھک گئے تو کئی دور کے رشتہ دار مدد کرنے حاضر ہو گئے۔ اس دوران مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ عرفان کے رشتہ داروں میں سے کسی نے کوئی مدد نہ کی۔ اس کے بھائی ایک دفعہ آدھ گھنٹے کے لئے آئے اور چلے گئے۔ عرفان کبھی ان کی بات نہ کرتا اور اگر میں شکوہ شکایت کرتی بھی تو وہ کہتا ''وہ مصروف ہوں گے''۔

جب اسپیشلسٹ ڈاکٹر کا علاج کارگر نہ ہوا تو تمہاری سلیمہ خالہ نے حکیم سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ہم ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے کہانی سن کر چند جڑی بوٹیاں تجویز کیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ جڑی بوٹیاں ایبٹ آباد کی پہاڑیوں میں دستیاب تھیں چنانچہ ہم نے اپنے ایک کزن کو وہاں بھیجا تاکہ وہ وہاں سے لا سکے ان جڑی بوٹیوں سے بھی عرفان کا دو ہفتے علاج کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔

عرفان کی طبیعت بہتر ہونے کی بجائے ابتر ہوتی گئی وہ رات رات بھر کمرے میں چکر لگاتا رہتا۔ اس کی گفتگو بالکل بے ربط ہو گئی تھی۔ بعض دفعہ وہ گھنٹوں بات نہ کرتا اور برآمدے یا دروازے میں بت بنا کھڑا رہتا۔ میں وجہ پوچھتی تو کہتا ''میں گہری سوچ میں تھا''

ایک دفعہ تو وہ نہانے غسلخانے گیا اور دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ کپڑے اور موزے پہنے کھڑا تھا۔ اس نے پانی کو چھوا تک نہ تھا۔ جب اس کی حالت مزید خراب ہوئی تو اس نے دیواروں، دروازوں اور ستاروں سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔

جب عرفان کی حالت اور بھی بدتر ہو گئی تو تمہاری نانی اماں نے مشورہ

دیا کہ ہمیں عرفان کو ایک روحانی فقیر، جو باباجی کے نام سے جانے جاتے تھے، کے پاس لے جائیں۔ تمہارے ماموں کو پیروں فقیروں پر بالکل اعتبار نہیں، وہ سائنسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ عرفان کا علاج پڑھے لکھے ڈاکٹروں سے کروانا چاہتے تھے نہ کہ ان پڑھ روحانی پیشواؤں سے۔ باباجی کی بات ہوتی تو سارے گھر میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ بعض لوگ انکے علاج کے حق میں تھے بعض اس کے خلاف۔ آخر میں جب سب نے مل کر میری رائے مانگی تو میں نے کہا ''مجھے اپنے خاوند کی صحت سے غرض ہے۔ اگر باباجی اسے ٹھیک کر سکتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔ چنانچہ میں خود تمہاری نانی اماں کے ہمراہ باباجی کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ باباجی نے کہانی سن کر کہا کہ عرفان پر کسی نے کالا جادو کر دیا ہے اور اس کا توڑ کالے بکروں کی قربانی ہے چنانچہ ہم نے دو کالے بکرے داتا دربار کے لنگر میں پیش کر دیے۔ باباجی نے پلیٹوں پر قرآنی آیات بھی لکھ کر دیں اور کہا کہ عرفان کو یہ پلیٹیں دس دن تک پلاتے رہو۔ ہم نے وہ پلیٹیں عرفان کو پینے کو دیں تو پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن جب تمہاری نانی اماں نے اصرار کیا تو اس نے ان کے احترام میں پلیٹیں بھی پینی شروع کر دیں۔

دس دن کے علاج کے بعد بھی جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو ہم پھر باباجی کے پاس گئے۔ اس دفعہ انہوں نے کہا ''ایک بڑی قربانی دو۔'' اس ملاقات کے بعد ہم نے ان کا علاج منقطع کر دیا۔ کیونکہ ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ بڑی قربانی کیا ہو سکتی ہے۔

اسی دوران ڈاکٹر سعید ایک دفعہ پھر ملنے آئے اور عرفان سے گفتگو کرنے کے بعد کہنے لگے کہ چونکہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ اس لئے ہمیں اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس بھیجنا چاہیے چنانچہ تمہارے محسن ماموں اور میں عرفان کو نفسیاتی بیماریوں کے ہسپتال میں ڈاکٹر مسعود کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر مسعود کا مشورہ تھا کہ ہم عرفان کو وہیں چھوڑ آئیں لیکن جب میں نے ہسپتال کا

دورہ کیا تو گھبرا گئی۔ وہاں کئی ایسے مریض تھے جو برسوں سے وہاں داخل تھے اور کبھی گھر نہ گئے تھے۔ ان کے خاندان انہیں بھلا چکے تھے۔ جب محسن نے مجھ سے پوچھا تو میں نے عرفان کے داخلے سے انکار کر دیا۔ جب محسن نے ڈاکٹر مسعود کو ہمارا فیصلہ سنایا تو وہ کہنے لگے کہ اگر تم اسے داخل نہیں کروانا چاہتے تو ہفتے میں دو دفعہ بجلی کے جھٹکوں کے علاج کے لئے لے آیا کرو اور علاج کے بعد واپس لے جایا کرو۔ ہم نے وہ مشورہ قبول کر لیا۔

عرفان ایک دفعہ تو محسن کے ساتھ بجلی کے علاج کے لئے چلا گیا لیکن پھر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ ایک دن تو عرفان کو لینے تانگہ آیا اور کوچوان چار گھنٹے تک انتظار کرتا رہا عرفان نے نہ جانا تھا نہ گیا۔ محسن نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا ''میں ذہنی مریض نہیں ایک گنہگار انسان ہوں میرا مسئلہ ذہنی نہیں، روحانی ہے'' اور پھر ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک شام عرفان کی کزن ذکیہ اس کا حال پوچھنے آئی۔ پہلے تو اس نے معذرت کی کہ وہ اتنا عرصہ حاضر نہ ہو سکی۔ پھر وہ کہنے لگی کہ وہ ایک ایسے معالج کو جانتی ہے، جو دھوپ کی شعاعوں اور پانی سے علاج کرتے ہیں اور شمسی صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی اور مریضوں کا علاج کیا ہے اور وہ مریض شفایاب ہو گئے ہیں۔ ''عین ممکن ہے شمسی صاحب عرفان کی کچھ مدد کر سکیں'' ذکیہ نے کہا'' عرفان اب تھک چکا ہے وہ کسی معالج سے ملنے نہیں جاتا'' میں نے بہانا بنایا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں، میں انہیں خود یہاں لے آؤں گی۔ ذکیہ نے مشورہ دیا۔

''یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا'' میں نے اس کے خلوص کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

اگلے دن ذکیہ شمسی صاحب کو لے آئی۔ وہ سفید بالوں والے دراز قد انسان تھے۔ اور انہوں نے سفید کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ انکے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ ذکیہ نے شمسی صاحب کا مجھ سے اور عرفان سے تعارف کروایا۔

میں نے علیحدگی میں شمسی صاحب کو ساری کہانی سنائی۔

اس دن عرفان اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے شمسی صاحب کو بتایا کہ اس کی کمر میں گردے کی جگہ پر درد ہو رہا تھا۔ شمسی صاحب نے کہا کہ ان کے پاس ایک خاص تیل ہے جو امید ہے اس کے گردے کی درد کو کم کر دے گا۔ شمسی صاحب نے عرفان کو بستر پر منہ کے بل لیٹنے کو کہا۔ انہوں نے بریف کیس سے نیلے رنگ کی بوتل نکالی اور مجھ سے کہا کہ میں اس کی کمر پر آہستہ آہستہ اس خاص تیل سے مالش کروں۔ چند ہی لمحوں میں عرفان کا درد ختم ہو گیا۔

''شمسی صاحب آپ نے تو کمال ہی کر دیا'' عرفان نے بے ساختہ تعریف کی۔ ''یہ تو خوشی کی بات ہے کہ میری تشخیص صحیح نکلی''۔

''اس علاج کے بارے میں مجھے کچھ بتائیں'' عرفان اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوال پوچھنے لگا۔

''میں سورج کی شعاعوں اور پانی سے علاج کرتا ہوں یہ ایک فطری علاج ہے۔ اس علاج کے فلسفے کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ سورج کی شعاعوں میں سات رنگ ہیں اس لئے ہمیں ان سب کی ضرورت ہے۔ جب کسی کے جسم میں کسی رنگ کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے اگر ہم یہ تشخیص کر لیں کہ کسی کے جسم میں کس رنگ کی کمی ہے تو پھر ہم اس شخص کا اس رنگ کے پانی سے علاج کرتے ہیں''

''تو میرے جسم میں کس رنگ کی کمی ہے؟'' عرفان متجسس تھا۔

''ہلکے نیلے رنگ کی''

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ چند خالی بوتلیں خرید لیں ان پر ہلکے نیلے رنگ کا پلاسٹک چڑھا دیں۔ پھر ان بوتلوں کو نلکے کے پانی سے بھر کر صبح سورج کی روشنی میں کوٹھے پر رکھ آیا کریں اور پھر شام کو ان بوتلوں کو نیچے لے آیا کریں اور پھر اس پانی کو پیتے رہیں اگر آپ چند ہفتوں تک وہ پانی پیتے رہے، تو مجھے امید ہے کہ آپ

کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ میں آپ کو یہ نیلے رنگ کا تیل بھی دے دوں گا، جس کی مالش سے آپ کے درد میں افاقہ ہو گا"

عرفان نیلے رنگ کے تیل کی مالش کروانے اور پانی پینے پر رضامند ہو گیا۔

جب شمسی صاحب جانے لگے اور میں نے فیس پیش کرنی چاہی تو وہ کہنے لگے "پہلی ملاقات تو ذکیہ بیٹی کے لئے تحفہ تھی۔ میں دو تین ہفتوں کے بعد دوبارہ آؤں گا اگر عرفان کی طبیعت بہتر ہوئی اور وہ علاج کامیاب ہوا تو پھر فیس لوں گا"

ہمارا خاندان ذکیہ اور شمسی صاحب سے بہت متاثر ہوا۔

عرفان نے اگلے دن سے نیلے رنگ کے پانی سے علاج شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد عرفان نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے والد کی قبر پر حاضری دینا چاہتا ہے میں اسے قبرستان لے گئی اور وہ اپنے والد کے سرہانے بیٹھا تقریباً دو گھنٹے تک خاموشی سے دعا مانگتا رہا۔ اگلے تین دن تک وہ متواتر اپنے والد کی قبر پر جاتا رہا۔ میں ہر روز اس میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی اور پھر چند دنوں کے بعد ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

ایک سہ پہر عرفان کے کمرے میں میں صوفے پر آرام کرنے لیٹی لیکن میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ مجھے نیند پڑ گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے عرفان کو اپنے پاؤں کے پاس بیٹھے ہوئے پایا، وہ میرے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا "میں تم سے کچھ سنجیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں" وہ مسکرا رہا تھا "میں حاضر ہوں" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہم دروازہ بند کر سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ہماری گفتگو میں مخل ہو"

"یہ تو کوئی مشکل بات نہیں۔ میں پانی کا ایک گلاس لے آؤں۔ پھر دروازہ بند کر کے تفصیلی گفتگو کرتے ہیں" میں اٹھ کر باورچی خانے کی طرف

جانے لگی تو وہ کہنے لگا۔ ''ایک گلاس میرے لئے بھی لے آنا''

میں پانی کا ایک جگ بھر لائی اور اپنی بہن سے کہا کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔ میں واپس آئی تو عرفان نے دروازہ بند کیا اور اپنے جی کی بپتا سنانے لگا۔

''جانم! آج میں تمہیں دل کے سارے راز بتا دینا چاہتا ہوں میرا ایمان ہے کہ میں نہ تو جسمانی طور پر بیمار ہوں، نہ ذہنی طور پر۔ مجھے نہ ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، نہ حکیموں کی۔ نہ پیروں کی حاجت ہے، نہ فقیروں کی۔ میرا علاج نہ تو گولیوں میں ہے نہ انجکشنوں میں نہ جڑی بوٹیوں میں ہے نہ بجلی کے جھٹکوں میں۔ میں کئی مہینوں سے اپنی روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا اب مجھے اپنے مسئلے کا حل مل گیا ہے۔''

میں خاموشی سے عرفان کی باتیں سن رہی تھی۔

''میری روح پر بھاری بوجھ اس لئے تھا کہ میں ایک ایسی ملازمت کر رہا تھا جس کا میں بالکل مستحق نہ تھا۔ میری Ph.D کی ڈگری جعلی تھی۔ پی ایچ ڈی کے امتحان کے آٹھ پرچوں میں سے سات پرچے تو میں نے اپنی محنت سے پاس کئے تھے لیکن آٹھواں پرچہ مجھے ایک دوست نے پہلے سے دے دیا تھا۔ چنانچہ میں نے تیاری کئے بغیر وہ پرچہ دیا اور کامیاب ہو گیا۔ وہ میری بے ایمانی تھی۔

چند مہینے پیشتر جب میرا ضمیر مجھے کچو کے لگانے لگا اور میرا احساس گناہ بڑھنے لگا تو میں نے نوکری سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا لیکن پھر مجھے تمہارے اور بچوں کے مستقبل کا اور گاڑی، گھر اور کاٹیج کا خیال آیا اور وہ خیال میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری ملازمت کے بغیر میرے بچوں کی تعلیم جو مجھے بہت عزیز ہے، متاثر ہو گی۔ چنانچہ میں ایک شدید تضاد کا شکار تھا اور اس تضاد نے مجھے مہینوں پریشان رکھا۔

مجھے اس بات کی بھی فکر تھی کہ اگر میں نے یونیورسٹی کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا تو پھر میں کیا کروں گا۔ میں بے کار کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔

آخر مجھے اپنے مسائل کا حل اپنے خوابوں میں مل گیا ہے وہ خواب جو میں پچھلی تین راتوں سے دیکھ رہا ہوں''

میں بت بنی عرفان کی باتیں سن رہی تھی۔

''پہلی رات مجھے کیا نظر آیا کہ میں فرشتوں کے ساتھ ہوا میں اڑ رہا ہوں وہ مجھے ایک عظیم الشان محل میں لے گئے۔ وہ محل ایک جھیل کے کنارے واقع تھا اور اس کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ جب میں اس محل میں داخل ہوا تو مجھے ایک فوارے کے گرد بہت سے لوگ دائروں میں بیٹھے نظر آئے۔ فرشتوں نے مجھے بتایا کہ پہلا دائرہ پیغمبروں کا تھا، انہوں نے آدم، نوح، ابراہیم، عیسیٰ، سلیمان، بدھا اور موسیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

دوسرے دائرے میں مختلف مذاہب کے صوفیا اور اولیا بیٹھے تھے۔ فرشتوں نے امام غزالی، شیخ عبدالقادر، داتا علی ہجویری، رابعہ بصری، سینٹ این اور سینٹ کرسٹوفر کی نشاندہی کی۔ آخر میں مجھے اپنے ابو نظر آئے جو میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور انتظار کرنے کو کہا۔ جب باقاعدہ کاروائی کا آغاز ہوا تو سب بزرگوں نے حضرت ابراہیم کو تخت پر جلوہ گر ہونے کی درخواست کی اور انہوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ میرے ابو نے حضرت ابراہیم سے درخواست کی کہ ان کے بیٹے کو صوفیاء کے گروہ میں شریک کر لیا جائے اور پھر انہوں نے مجھے ان کی خدمت میں پیش کیا: حضرت ابراہیم نے میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور مجھے اس فوارے سے وضو کرنے کو کہا۔ میں وضو کر کے لوٹا تو وہ کہنے لگے کہ مجھ میں ایک صوفی بننے کی تمام خصوصیات ہیں لیکن اس راستے پر چلنے کے لئے مجھے کچھ قربانیاں دینی پڑیں گی اور ان میں سے ایک قربانی میری ملازمت ہے پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ کینیڈا میں Whitby کے شمال میں ایک گاؤں ہے جہاں ایک بزرگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اپنا Farm اور اس میں ملنے والی بکریاں، بھیڑیں، گائیں اور مرغیاں میرے

حوالے کر دیں گے۔ جب میں وہاں جاؤں گا تو مختلف مذاہب کے لوگ میرے پاس آیا کریں گے اور مجھ سے روحانیت کا درس لیا کریں گے۔

جب میں نے حضرت ابراہیم کا ہاتھ چوما تو انہوں نے میرے صوفیاء کے حلقے میں شامل ہونے کا اعلان کیا اور سب بزرگوں نے مجھے مبارک باد دی۔ میں اس مبارکباد سے اتنا خوش ہوا کہ میری نیند کھل گئی۔

دوسری رات خواب میں میری اپنے ابو سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگے کہ ان کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ میری چند اولیاء، صوفیاء اور درویشوں سے ملاقات کروائیں۔

''لیکن ہم انہیں کیسے پہچانیں گے''؟ میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

''ان کی عاجزی سے''

''صوفیاء اپنی عاجزی کا اظہار کیسے کرتے ہیں''

''وہ نہ تو اونچی آواز سے بات کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں سے اونچا کبھی بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ ان کے سامنے زمین پر بیٹھیں تو وہ بھی کرسی، صوفے یا تخت پر بیٹھنے کی بجائے آپ کے ساتھ زمین پر بیٹھیں گے۔ میرے ابو نے مجھے بتایا کہ چونکہ میں اولیاء کے گروہ میں نیا ہوں۔ اس لئے میں تو انہیں نہیں پہچانوں گا لیکن ساری دنیا کے اولیاء مجھے پہچان لیں گے کیونکہ عالم ارواح میں وہ سب اس رات وہاں موجود تھے جس رات مجھے صوفیاء کے حلقے میں قبول کیا گیا تھا۔''

جب ہم سفر پر نکلے تو سب سے پہلے میرے ابو مجھے ہندوستان لے گئے وہاں ہماری ملاقات ایک بزرگ موچی سے ہوئی۔ وہ بڑے خلوص سے مجھے ملے اور انہوں نے مجھے پیار سے گلے لگایا انہوں نے ہمیں چائے بھی پیش کی۔ گفتگو کے دوران وہ کہنے لگے۔ بددیانتی کے اس دور میں اپنے ہاتھوں سے محنت کرنا اور حق حلال سے کمائی کرنا آدھا تصوف ہے۔ ان کا چہرہ نہایت پرسکون تھا اور میں ان سے مل کر بہت متاثر ہوا۔

پھر میرے ابو مجھے یورپ لے گئے۔ جہاں ہماری ملاقات ایک نرس سے ہوئی جو ایک یتیم خانے کی مہتمم تھیں۔ انہوں نے مجھے درویشوں کے حلقے میں شامل ہونے کی مبارکباد دی۔ میں اس مبارکباد سے بہت حیران ہوا۔ انہوں نے مجھے مٹھائی بھی پیش کی۔ انہوں نے ہمارا چند یتیم بچوں سے بھی تعارف کروایا۔ اس یتیم خانے میں ہر رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے بچے تھے۔ وہ نرس کہنے لگیں ''یہ سب خدا کے بچے ہیں اور بچے پھولوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کا خاص خیال رکھنا چاہیے تاکہ انہیں زمانے کی گرم ہوا نہ لگے اور وہ مرجھا نہ جائیں۔''

تیسرے درویش جن سے ہماری اس رات ملاقات ہوئی وہ مشرق وسطیٰ میں روحانیت کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور شفقت سے ماتھے پر بوسہ دیا۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا ''مذہب جسم ہے اور تصوف روح۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے جسم کو پکڑ رکھا ہے اور روح کو کھو دیا ہے۔'' انہوں نے یہ بھی کہا کہ شریعت ماننے والے چاہے وہ مولوی ہوں، پادری ہوں یا راہب۔ لوگوں میں تعصب کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں جبکہ صوفی دلوں میں پل تعمیر کرتے ہیں اور تمام مذاہب کا مقصد انسان دوستی اور انسانی ارتقاء کی فضا تیار کرنا ہے۔''

اس ملاقات کے بعد میرے ابو نے الوداع کہا اور رخصت ہو گئے۔

تیسری رات خواب میں میرے ابو مجھے کینیڈا لے گئے اور مجھے وہ Farm دکھایا، جہاں مجھے جانا تھا۔ انہوں نے سفر کے دوران مجھے روحانی دنیا کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ مجھے ولی، ابدال، قطب اور غوث کے مراتب سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کرہ ارض کا ہر حصہ کسی نہ کسی صوفی کے زیر سایہ ہوتا ہے۔ جو اس علاقے کی روحانی ضروریات کا خیال رکھتا ہے اور جب ایک صوفی کے جانے کا وقت آتا ہے تو وہاں دوسرا صوفی بھیج دیا جاتا ہے۔ جب ہم Whitby کے

شمال میں پہنچے تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس گاؤں کا نام درویش نگر (Saint-field) تھا جس کے ایک Farm پر بزرگ درویش ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگے ''آپ نے کافی دیر کر دی'' میرے ابو نے جواب دیا ''آپ فکر نہ کریں یہ جلد ہی یہاں آجائیں گے'' ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

وہ بزرگ کسان تھکے تھکے سے دکھائی دے رہے تھے، کہنے لگے ''میں اس علاقے کے لوگوں کی پچھلے بیس سال سے خدمت کر رہا ہوں۔ اب میرے جانے کا وقت آگیا ہے''

اس ملاقات کے بعد میرے ابو نے بھی شب بخیر کہا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے''

اس گفتگو کے بعد سے عرفان ایک بالکل ہی مختلف انسان بن گیا ہے۔ اس نے سادہ کپڑے پہننے اور سادہ غذا کھانی شروع کر دی ہے۔ اس نے داڑھی بڑھالی ہے اور مذاہب عالم اور روحانیات پر کتابیں پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اس کی بیماری کے سب عوارض رخصت ہو گئے ہیں۔

عرفان نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اب وہ کنیڈا واپس آکر ایک نئی درویشانہ زندگی کا آغاز کرے گا۔

چنانچہ اب ہم واپس آنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

تمہاری

امی

جب ہم واپس کنیڈا آئے تو اپنے گھر کو دیکھ کر اس گاؤں کی یاد آئی جو کسی طوفان کی نذر ہو گیا ہو۔ میز پر بجلی کے، پانی کے، بینک کے، بیسیوں Bills اور درجنوں خطوط پڑے تھے۔ گھر کی دیواروں، فرنیچر، پودوں، الغرض ہر چیز سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ ماحول کافی سوگوار تھا۔ میں جس قدر فکر مند تھی۔ عرفان اسی قدر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہماری تمام جائیداد اور

آرام و آرائش کے سارے سامان کی قیمت پانی کے ایک گلاس سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اپنے تمام قیمتی سوٹ، ٹائیاں اور جوتے دوسروں کو تحفتاً دے دیے اور کھدر کا کرتا شلوار پہننا شروع کر دیا۔ وہ اسے درویشوں کا پہناوا کہہ کر پکارتا۔ وہ مختلف گرجوں، مسجدوں، مندروں اور دیگر عبادت گاہوں میں جانے لگا اور اپنے دوستوں کا نیا حلقہ بنانے لگا۔ آخر اسے Whitby کے شمال میں وہ گاؤں مل گیا جہاں بہت سے مرد اور عورتیں ایک Commune کی طرح درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ اس کمیون کا سربراہ ایک بوڑھا کسان تھا۔ وہ بھی ایک درویش صفت انسان تھا۔ اس نے نہ صرف عرفان کو اپنے حلقے میں خوش آمدید کہا بلکہ چند ہفتوں کے بعد اپنے کمیون اور اپنے معتقدین کی ذمہ داری بھی عرفان کے حوالے کر دی۔ عرفان کو یوں لگا جیسے اس نے اپنے خواب کی تعبیر پالی ہو۔

عرفان کے کام نہ کرنے سے ہمیں بہت مالی نقصان ہوا۔ بعض دوستوں کا مشورہ تھا کہ میں Personal Bankruptcy کا اعلان کر دوں۔ اس طرح میں ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤں گی لیکن میری غیرت اور انا نے گوارا نہ کیا اور میں نے اپنا سونا اور سامان بیچ کر سارے قرضے اتار دیے۔ میں نے اپنا گھر، کار اور کاٹیج سب بینک کے حوالے کر دیے۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی کشتی نوح کو بھی خدا حافظ کہنا پڑا کیونکہ وہ بھی ہمیں نہ بچا سکی۔

سعدیہ اور عدیل پر بھی برے دن آئے۔ سعدیہ امتحان میں فیل ہو گئی اور عدیل اور اس کی گرل فرینڈ کے رشتے میں دراڑیں پڑ گئیں۔

ایک دفعہ عدیل اور سعدیہ دونوں مل کر اپنے ابو سے ملنے اس کے کمیون گئے۔

جب وہ کشادہ کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرفان کو گدوں کے فرش پر بیٹھے ہوئے پایا اس کے چاہنے والوں نے اس کے گرد دائرہ بنایا ہوا

تھا۔ ان لوگوں میں ہر رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے مرد اور عورتیں شامل تھے۔ وہ عرفان کو دل کا حال سنا رہے تھے اور وہ ان میں اپنے تجربات اور دانائی کے تحفے بانٹ رہا تھا۔ وہ اس ماحول میں بہت پر سکون نظر آ رہا تھا۔

عدیل اور سعدیہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے کبھی اپنے ابو کو لمبے بالوں، سفید داڑھی اور سفید کرتے شلوار میں ملبوس نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو گاؤ تکیوں اور کتابوں کو بکھرے ہوئے پایا۔

جب محفل برخواست ہوئی تو سعدیہ اور عدیل اپنے ابو سے ملنے آگے بڑھے۔ عرفان نے انہیں محبت سے گلے لگایا اور اپنے ایک شاگرد کو چائے، ڈبل روٹی، Bagel اور Jam لانے کو کہا۔

عرفان نے بچوں کی خیریت پوچھی تو سعدیہ نے بتایا کہ وہ امتحان میں ناکام رہی ہے۔ عرفان نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا ''اس دنیا کے امتحانوں سے اُخروی امتحان زیادہ اہم ہے۔''

جب عدیل نے اپنے ابو کو بتایا کہ اس کی محبوبہ اسے چھوڑ کر چلی گئی اس لئے وہ دل برداشتہ اور غمگین رہتا ہے تو عرفان کہنے لگا کہ ہم سب اس دنیا میں اکیلے آئے ہیں اور اکیلے ہی رخصت ہوں گے اس لئے دنیاوی چیزوں سے دل لگانا عبث ہے۔ دنیا کی ہر چیز عارضی ہے۔ اس زندگی میں ہم اس مسافر کی طرح ہیں، جو اپنے لمبے سفر میں کچھ عرصے کے لئے کسی درخت کے سائے میں رک جاتا ہے۔

جب چائے کا سامان آیا تو عرفان نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر بچوں کو پیش کی۔

عرفان نے سعدیہ اور عدیل سے کہا کہ وہ جب تک چاہیں اس کے پاس رہ سکتے ہیں۔ اس کمیون کا دروازہ ہر مسافر اور ہر مہمان کے لئے کھلا ہے۔ وہاں سب ایک پر سکون زندگی گزارتے ہیں۔ وہ مل جل کر کام بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔

عرفان نے بچوں کو الوداع کہتے ہوئے کہا کہ مادی دنیا کی دوڑ میں جیتنے والے بھی خسارے میں رہتے ہیں۔

سعدیہ اور عدیل لوٹے تو ان کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں عرفان سے چند دفعہ یہ سوچ کر ملنے گئی کہ شاید اسے خاندان کی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے لیکن ہر دفعہ میں آنکھوں میں آنسو لئے لوٹی۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور میری طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے بہت سے ٹیسٹ کرنے کے بعد تشخیص کی کہ مجھے Thyro-toxicosis ہو گیا ہے اور میرے تھائرائڈ گلینڈ نے کام کرنا بند کر دیا ہے اور وہ مرض ذہنی پریشانی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے مجھے آرام کرنے اور ریڈیو تھرپی سے علاج کروانے کا مشورہ دیا۔ میں نے پاکستان فون کیا تو سب رشتہ داروں نے لاہور آنے کا مشورہ دیا۔ اس واقعہ کے بعد میں اور بھی تنہا محسوس کرنے لگی۔ آخر پچھلے ہفتہ جب میں عرفان سے ملنے گئی تو میں بہت دل برداشتہ تھی۔ اس شام میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور مدتوں سے جو کچھ دل میں تھا وہ زبان پر آگیا۔ میں نے کہا ”عرفان مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں، جاگتے میں، ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ تم تو اگلی دنیا میں جنت کے خواہشمند ہو اور ہم اس دنیا میں جہنم میں جل رہے ہیں۔

عرفان میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تھک چکی ہوں اور نڈھال ہو چکی ہوں۔ اپنی ساری توانائی تمہاری نگہداشت پر صرف کر چکی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی کچے راستے پر صدیوں سے چل رہی ہوں۔ اور منزل ابھی تک نہیں آئی۔ میں تم پر اپنا سب کچھ قربان کر چکی ہوں۔ اگر میرے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہوتی تو میں بھی ہزاروں ڈالر کما سکتی اور کسی کی محتاج نہ ہوتی۔

میں اب بیمار ہو گئی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نے بتایا کہ ذہنی پریشانی سے میرے

تھائرائڈ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور مجھے Thyrotoxicosis کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ میں نے آخری فیصلہ کیا ہے کہ میں آرام اور علاج کیلئے پاکستان چلی جاؤں۔

عرفان کیا تم نے کبھی اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے اپنے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے ؟''

عرفان میری ساری باتیں تحمل اور بردباری سے سنتا رہا پھر اس نے اٹھ کر میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہنے لگا، ''رفیقہ ایک دن تم ان سب رازوں سے آشنائی حاصل کر لو گی۔ ایک دن تمہیں یہ سب باتیں سمجھ آجائیں گی۔ میری دعا ہے کہ تمہیں سکون دل کی دولت ملے۔ ایسی دولت جو تمہیں ساری دولتوں سے بے نیاز کر دے۔'' اس رات جب میں لوٹ رہی تھی تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں عرفان کو ملنے کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔

۱۹۹۵ء

عقیدوں کے
شہر میں
تجربوں کا
آدمی

سعید انجم

خالد سہیل کا تخلیقی سفر تلاش (۱) سے شروع ہوا۔ گھر کی اجنبیت نے اسے ہجرت کی وادیوں میں اتارا۔ نئی منزلوں کے لئے وہ نکلا تھا اور نئے رشتے اس کا مدعا تھے۔

کس نئی منزل تک وہ پہنچا؟

کون سے نئے رشتے اس نے دریافت کیے؟

سوالات کے بجائے یہ توقعات ہیں جن کا بیج خالد سہیل نے خود بویا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے تخلیقی سفر کا پھل چکھیں، آیئے ہم وہ اسباب جان لیں، جن کی وجہ سے شاعر کو اپنے گھر میں اجنبیت محسوس ہونے لگی۔

''ایک پرندے کی خوابِ غفلت سے آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کا آشیانہ فرسودہ روایات کی تیلیوں اور بوسیدہ اقدار کی گھاس پھونس کا مرہونِ منت ایک قفس تھا جسے آشیانہ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے شام و سحر ایک ایسے درخت پر گزرتے جہاں خاندان کے آسیب سایہ فگن رہتے۔'' (۲)

خاندان کا ادارہ اور آسیب؟ قاری چونکتا ہے۔

ایک نیم تاریک روشن مکان اپنے دروازے، اسی مصنف کے لئے کھولتا ہے جو اسے خود روشن کر دے۔ چراغ، دیا اور بتی تو ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ اچھا لکھنے والا تو بس لو اونچی کرتا چلا جاتا ہے اور قاری؟ نہیں مکان! مصنف کی مہارت، طہارت اور ذہانت کے مطابق روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

خالد سہیل کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گرتی دیواروں اور دیمک زدہ شہتیروں پر کھڑے مکانوں میں روشنی کے لئے جگنو تلاش کرنے نکلا ہے۔ اس کے جذبوں کی تازگی اسے نئی پگڈنڈیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ (۳)

پگڈنڈیوں پر چلنے والے مسافر میں راوی ہمیں بتاتا ہے کہ پگڈنڈی بس ابتداء میں غیر محفوظ ہوتی ہے۔ بعد میں وہ ایک شاہراہ بن جاتی ہے۔ اس بات سے مصنف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نئی نسل کو تجربے کرتے رہنا چاہئے۔ (۴)

شاعری کے مجموعہ تلاش کے بعد خالد سہیل کے تخلیقی سفر کا تجربہ ایک افسانوی مجموعہ ''زندگی میں خلاء'' کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس میں ہمیں ایک تقابل ملتا ہے، وطن عزیز میں لوگ زندہ رہنے کے لئے متحرک تھے، نئے ملک میں لوگوں کو یہ طے کرنا تھا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ کیسے ہو؟ Dignified Death Clinic کی رجسٹرڈ نرس بتاتی ہے کہ: ''اس Clinic میں مرنے کے تین طریقے ہیں۔ تین منٹ کا، تین گھنٹوں اور تین دنوں کا۔'' ۔۔۔۔اور ڈاکٹر سمتھ کہتا ہے۔ ''موت کو پر سکون بنانے کے لئے ہم دو طرح کی گیس استعمال کرتے ہیں۔ ایک سے انسان مسکرا دیتا ہے اور دوسری سے رو دیتا ہے۔ تم کون سی گیس پسند کرو گے؟'' (۵)

ڈونا کی زندگی کے آخری سالوں کا ماجرا خالد سہیل نے Flashes کی صورت میں بیان کیا ہے۔ افسانے کی آخری لائنیں غور طلب ہیں:

''ڈونا اپنے بستر پر لیٹی موت کی آغوش میں سو رہی تھی اور اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ٹی وی پر فلم چل رہی تھی۔ اس کے گھر میں پودے، پرندے اور جانور تو تھے، لیکن انسان نہیں تھے۔'' (۶)

پڑھنے والوں کے لئے ''زندگی میں خلاء'' کے افسانے کنیڈا کی زندگی کے مختلف رخ نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک خاتون کہتی ہے۔ ''میں مدتوں شادی کے کچے دھاگے سے لٹکتی رہی۔ اس شادی کو محفوظ کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بچہ برف کے ٹکڑے کو محفوظ کرنے کے لئے اپنی ہتھیلی میں دباتا ہے۔'' (۷)

ایک افسانے میں خالد سہیل کا ایک کردار کسی کے ساتھ ناچنے کو رومانی ورزش قرار دیتا ہے۔ ایک دوسری جگہ مصنف نے لکھا ہے: ''جنسی تعلق بھی کھانے پینے کی طرح ایک فطری خواہش ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی تسکین اختیاری ہے۔ بنیادی طور پر یہ دو انسانوں کا ذاتی تعلق ہے جس میں مذہب یا قانون کو بہت کم دخل ہے۔'' (۸)

جس معاشرے میں روزمرہ زندگی مندرجہ بالا رویوں سے عبارت ہو، وہاں پر پاکستانی والدین اپنے بچوں کا تحفظ وطن اور مذہب کی ڈھال سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا جو اثر اولاد پر ہوتا ہے اس کی تصویر کشی دیکھئے:

''میں ابو سے تنگ آگئی ہوں۔ اسلام اور پاکستان کے نام پر ناٹک زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ میرے لئے یہ دونوں الفاظ گالی بن چکے ہیں۔ میرا بس چلے تو آج ہی گھر سے بھاگ جاؤں ۔۔۔۔۔ میں اپنی اٹھارہویں سالگرہ کا انتظار کر رہی ہوں۔'' (۹)

بچوں کا ردعمل ایسا شدید کیوں ہوتا ہے؟ خالد سہیل ہمیں بتاتا ہے:

''مہاجروں کے بچے غیر معمولی ہوتے ہیں۔ یا تو فنکار بنتے ہیں یا ذہنی خلل کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ انہیں ایک طرف تو ماضی کی روایات اور اقدار کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور دوسری طرف نئے تقاضوں اور مسائل کو گلے لگانا پڑتا ہے جو کامیاب ہو جائیں، وہ فن کار اور جو ناکام ہو جائیں وہ دیوانے بن جاتے ہیں'' (۱۰)

خالد سہیل کے یہی خیالات بعد میں ''ٹوٹا ہوا آدمی'' نام کے ناولٹ

میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک بگڑے ہوئے پاکستانی بیٹے کی کہانی ہے، جو کنیڈا پہنچ کر وہاں کی انفرادی آزادیوں کے مزے لوٹنے کے لئے خاندان کی اجتماعی ذمہ داریوں سے روگردانی ضروری سمجھتا ہے۔ (شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے شام و سحر ایک ایسے درخت پر گزر رہے ہیں جہاں خاندان کے آسیب سایہ فگن رہتے ہیں؟) اس کردار کے غیر متوازن رویے، اسے قانون شکنی کی بدترین سرحدوں تک لے جاتے ہیں۔ لیکن وہ جیل جانے کی بجائے ذہنی شفاخانے میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں پر وہ خود باپ بن جانے کے بعد ہی ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ ناولٹ کے آخر میں یہ مرکزی کردار شہزاد اپنے باپ کے ہم عمر ایک کینیڈین کردار کے مشورے پر معاشرتی اداروں کی سماجی پابندیاں قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔

اس طویل کہانی نے ادب کو جو دیا ہے، سو دیا لیکن قاری اور مصنف کو اس تحریک نے ایک مختصر بیان اور واضح نتیجہ تک پہنچنے میں بہت مدد کی: ''ہم میں سے ہر ایک کے دو خاندان ہوتے ہیں.... ایک خاندان جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں اور دوسرا خاندان جسے ہم خود بناتے ہیں۔'' اور نتیجہ یہ کہ: ''ہم اجتماعی طور پر آہستہ آہستہ پہلے خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف سفر کر رہے ہیں''۔

''ٹوٹا ہوا آدمی'' میں پہلے خاندان سے دوسرے خاندان کی سمت جانے والی نئی پگڈنڈیوں پر افزائش نسل کی منزل تو موجود ہے لیکن عقل و دانش کا وہ ورثہ جو باپ سے بیٹے تک پہنچا ہے وہ اس ناولٹ میں شہزاد کے باپ کی عمر کے ایک کینیڈین کردار سے اس تک منتقل ہوتا ہے۔ پڑھنے والا یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کہیں یہ کہانی نئی صورت حال میں خونی رشتوں پر سوالیہ نشان لگانے کیلئے تو نہیں لکھی گئی؟

''زندگی میں خلاء کے متعلق خالد سہیل نے لکھا تھا: ''عورتیں بادلوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ بادل جو کبھی تو ہفتوں تک نہیں برستے اور برستے

ہیں تو برستے ہی چلے جاتے ہیں۔ صحراؤں میں نہیں برستے اور دریاؤں پر برس پڑتے ہیں۔"..... یہ اس زمانے کی بات ہے جب مصنف عورتوں اور بادلوں کو خود مختار سمجھتا تھا چند ہی سالوں کے تخلیقی سفر نے مصنف کیلئے عورتوں کی خود مختاری پر سوالیہ نشان لگادیا۔ نئی کتاب میں نیا بیان ان الفاظ کے ساتھ درج ہوا: "خاندان بادلوں کی طرح ہوتے ہیں جو پانی کے قطروں کی جسامت یا ہواؤں کے رخ بدلنے سے اپنی صورت بدل لیتے ہیں"(۱۱)

اس نئی منزل پر نئے سوال، خالد سہیل کی راہ تک رہے تھے۔ ہواؤں کے رخ کا تعین کون کرتا ہے ؟اور۔ جسامت پر اثرانداز ہونے والے عناصر کون سے ہیں ؟

ایک الف لیلوی کردار کی طرح خالد سہیل متحرک ہو گیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہواؤں کے رخ کا تعین کون کرتا ہے۔ وہ ایسے قصوں تک جا پہنچا۔ جنہیں کچھ لوگ مقدس مانتے تھے۔ جن کے مطابق ہوائیں دیوتاؤں کے تسلط میں تھیں۔ لوگ انہیں بھگوان کی طرح پوجتے تھے۔ اس مہم میں اس نے دریافت کیا کہ انسان کو بھگوان کی نہیں ایمان کی ضرورت ہے۔ یہی سرگزشت "بھگوان، ایمان، انسان،" کے نام سے ایک کتاب کی صورت مرتب ہو گئی۔

بھگوان کو غیر ضروری ثابت کرنے کے لئے خالد سہیل نے برٹرینڈ رسل کی ایک پرانی تقریر کا انتخاب کیا۔ 1927 کی اس تقریر کا موضوع تھا میں عیسائی کیوں نہیں ہوں ؟

برٹرینڈ رسل کا خدا اور حیات بعد الموت پر ایمان نہیں تھا۔ تقریر کے مطابق انہوں نے کہا: "خدا پر ایمان لانے کی سب سے بڑی وجہ ہماری وہ ضرورت ہے جسے ہم تحفظ کے احساس سے موسوم کرسکتے ہیں۔ لوگوں کے لئے یہ خیال کہ ان کا کوئی نگہبان ہے جو ان کا خیال رکھتا ہے بہت ضروری ہے۔ اس خواہش یا احتیاج سے خدا پر ایمان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے"۔ اس تقریر سے وہ دو باتیں واضح کرتے ہیں :

۱۔ ہمیں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہیے، زندگی اور کائنات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہیۓ۔

۲۔ ہمیں مردہ ماضی کے مقابلے میں زندہ اور پرامید مستقبل کی ضرورت ہے برٹرینڈرسل کے بعد خالد سہیل نے ابراہیم میسلو کا انتخاب کیا ہے۔ وہ مذہب کے علاوہ سائنس کی کارکردگی پر بھی سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب ایسے عقائد کا آمیزہ بن گیا ہے۔ جنہیں عاقل و بالغ لوگوں کیلئے سمجھنا اور ان پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ جب سائنس نے غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھا تو زندگی کے مقاصد، معانی اور اقدار سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سائنس جو زندگی کی اقدار سے آنکھیں چرائے کامل سائنس نہیں ہو سکتی اور وہ مذہب جو انسان کی جذباتی اور عقلی ضروریات کا خیال نہ رکھے، کامل مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس صورت حال میں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں سائنس اور مذہب دونوں کی حدود کو دوبارہ متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ کیسے ہو گا؟

ایرک فرام کے تعاون سے خالد سہیل ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر ایمان، عقل اور سائنس کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا تو ہمیں اسے ماضی کے فرسودہ نظام کا بچا کچا حصہ سمجھ کر نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ایرک فرام کے خیال میں ایمان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک ایمان کسی بڑی طاقت کے فرمودات کو کلیۃً قبول کرنے کا نام ہے جو ایک غیر صحت مندانہ اور غیر منطقی رویہ ہے۔ کیونکہ اس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔ دوسرا ایمان ایک مثبت قدر ہے۔ ایسا ایمان انسان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر قبول کیا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا ایمان معقول اور صحت مند کہلایا جا سکتا ہے۔ انکے خیال میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آج کا انسان کس قسم کے ایمان کو ترجیح دیتا ہے۔

باقی رہے وہ عناصر جو جسامت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تو اس سلسلے میں افزائش نسل کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے کبھی کنبے کی

سربراہی ماں کے پاس تھی۔ عورت کی اس حیثیت میں تبدیلی کیوں آگئی؟ پچھلی صدی میں مغرب کی عورتوں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ عقیدوں کی وادی میں خاک چھاننے کے بعد خالد سہیل کے سفر کی منزل عورتوں کی یہ جہد ہی ٹھہری۔ چنانچہ صحرا نوردی کی یہ روداد ''مغربی عورت، ادب اور زندگی'' کے نام سے مرتب ہوگئی۔

اس کتاب میں پچھلی ایک صدی میں متحرک رہنے والی عورتوں کے ان مضامین، انٹرویوز اور افسانوں کا انتخاب اور ترجمہ ہے، جو عورتوں کے مساوی حقوق کیلئے چلائی جانے والی تحریک کی بنیاد بنے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان ''عورتیں اور ادب'' ہے جب کہ دوسرے حصے کا نام ''عورتیں اور زندگی'' رکھا گیا ہے۔ اس حصے کے عنوانات سے بعض موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً عورتیں اور محبت، عورتیں اور زنا بالجبر، عورتیں اور حیض، عورتیں اور ابارشن وغیرہ۔ اس کتاب کے انتساب میں خالد سہیل نے لکھا:

''مغربی عورت کا پیغام مشرقی عورت کے نام''

عورتوں کے معاملات میں خالد سہیل کی دلچسپی کینیڈا پہنچ کر شروع نہیں ہوئی۔ پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی ستر سالہ تاریخ میں یہ پہلا مرد ڈاکٹر تھا جس نے زچہ بچہ وارڈ میں انٹرنشپ مکمل کی۔ لیبر روم میں بچے پیدا کرنے کا تجربہ اتنا اچھا رہا کہ اس نے لکھا ''اگر میرے بس میں ہوتا تو آدھی زندگی میں بطور مرد اور آدھی زندگی بطور عورت گزارتا'' شاید اسی لئے اس نے اپنی پہلی کتاب کے دیباچے میں لکھا۔ ''میری ذات اور شخصیت کے ارتقاء میں عورت کی رفاقتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے'' (۱۲)

زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ پڑھنے کے بعد خالد سہیل کے اس بیان پر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ اس نے ''انفرادی اور معاشرتی نفسیات'' میں اسے لکھا ہے۔ ''تقریباً پانچ سو لوگوں کا مجمع تھا۔ ملک کے تین مشہور شاعر جج تھے۔ بہت سے طلباء اور طالبات نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا عنوان

تھا ''سرخ دائرہ'' وہ نظم ایک ایسی نوجوان عورت کے بارے میں تھی جسے زندگی میں پہلی مرتبہ حیض نہ آیا تھا اور وہ متفکر تھی کہ کہیں حاملہ تو نہیں۔ نظم اس اندازے سے لکھی تھی کہ حمل اور حیض کا ذکر تو نہ تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

میں اسٹیج پر گیا، سارا ہال خاموش تھا، میں نے نظم سنائی، سارا ہال خاموش رہا۔ میں واپس لوٹ آیا۔ سارا ہال خاموش رہا۔ میں سمجھا، کسی کو میری نظم سمجھ نہیں آئی۔ نظم اس طرح لکھی گئی تھی کہ ایک عورت اپنے بارے میں بات چیت کر رہی تھی۔ چنانچہ نظم کی ''میں'' عورت تھی۔ مقابلے کے آخر میں میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اول انعام، ایک وینس کا مجسمہ مجھے پیش کیا گیا۔ اس وقت سارا ہال تالیاں بجا رہا تھا۔ اگلے دن، میری ایک جج شاعر سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے ''میں نے پورے اردو لٹریچر میں اس خیال پر کوئی نظم نہیں پڑھی۔ تمہارے کلام میں جدت تھی'' (۱۳)

خالد سہیل کی مسافرت کا ایک پڑاؤ یروشلم بھی تھا۔ عقیدوں کا شہر۔

''امن کی دیوی کی ابتدا اسرائیل کے سفرنامے سے ہوتی ہے۔ ''ایک دیرینہ خواہش'' کے ذیل میں اس نے لکھا ہے۔ ابھی مجھے کینڈین پاسپورٹ حاصل کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مجھے معلوم ہوا یروشلم میں نفسیات اور خاندان کے مسائل پر ایک کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ میں نے رجسٹریشن فیس بھیج دی اور ہسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ چھٹی ملی تو میں نے بوریا بستر تیار کیا اور ابن بطوطہ کی طرح سفر پر نکل کھڑا ہوا۔''

پشاور کا ڈاکٹر کینڈین ڈگری کے بعد اب ماہر نفسیات تھا۔

یروشلم کی سیر کے بعد خالد سہیل نے اپنے جذبات اور خیالات کو ''تین سپاہی'' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔ شہر کے تین کونوں میں بیک وقت تین سپاہی بندوقوں سمیت عبادت میں مصروف ہیں۔ یہودی سپاہی موسیٰ کے خدا کا شکر گزار ہے اور کہتا ہے ''اے خدا تو مجھے اتنی ہمت دے کہ میں عیسائی اور

مسلمان سپاہیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کروں اور ان کے سر قلم کر دوں۔'' عیسائی سپاہی خدا کا ممنون ہے کہ اس نے اپنا بیٹا دے کر انہیں نوازا۔ وہ کہتا ہے: ''اے خدا مجھے اتنا حوصلہ دے کہ میں یہودی اور مسلمان سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔''

مسلمان سپاہی امت محمدیہ میں پیدا ہونے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہوئے کہتا ہے۔ اے خدا مجھے اتنی طاقت دے کہ میں یہودی اور عیسائی سپاہیوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دوں۔''

عقیدوں کے شہر میں خالد سہیل کا یہ تجربہ قاری کو انسانی اقدار کے بارے میں غور کرنے پر اکساتا ہے۔

ایک نارویجن دوست نے مجھے بتایا تھا کہ کیتھولک معاشرے میں سماجی زندگی کی پیچیدگیاں جب گناہ و ثواب کے پیمانوں میں ڈھلتی ہیں تو لوگ پادری کے سامنے اپنے اعمال کو قبول کرنے کے بعد ضمیر کے بوجھ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں پروٹسٹنٹ معاشرے میں پادری کا رول ماہر نفسیات ادا کرتا ہے۔ سماجی زندگی کے غبار سے بھرے موکل آتے ہیں اور مسیحا کے سامنے اپنی پیچیدگیاں اگلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے مسائل کے حل کیلئے ڈاکٹر کے پاس پادری کی طرح روحانی اقدار کے کوئی فارمولے موجود نہیں ہوتے۔ اسے تو انسانی اقدار کی چھٹیوں سے مرد، عورت کے تعلقات اور محبت نفرت کے جذبات کو الٹنا پلٹنا ہوتا ہے تاکہ دودھ اور پانی کا فرق واضح ہو سکے۔

ماہر نفسیات کی حیثیت سے خالد سہیل کو بھی اپنے کان کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔ پادری کی طرح وہ کیبن کی اوٹ میں نہیں بیٹھتا۔ معاشرتی پیچیدگیوں اور ان کے نتائج کو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اس کے موکل ہی اس کے کردار بن جاتے ہیں۔ ''بڑی'' نام کے افسانے میں سارا کہتی ہے میری ماں نے ایک حبشی سے شادی کر کے مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی قبر میں اتار دیا تھا۔ میں زندگی کی سوتیلی بیٹی ہوں'' (زندگی میں خلاء)

زہرا ہرسٹن ایک سیاہ فام امریکن تھی۔ وہ سرخ بتی پار کرتے ہوئے پکڑی گئی تو اس نے جج کے سامنے کہا۔ ''میں نے سفید فام لوگوں کو سبز بتی پر سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا تو سمجھی کہ سرخ بتی کالوں کیلئے ہے۔''

نسلی تعصب کے حوالے سے مندرجہ بالا اقتباس ''کالے جسموں کی ریاضت'' نامی کتاب سے لیا گیا ہے جس پر مترجمین کی حیثیت سے خالد سہیل اور جاوید دانش کے نام درج ہیں۔ قاری سوچتا ہے: یہ جاوید دانش کون ہے؟

خالد سہیل کے بقول ''۔۔۔۔۔کہانیاں لکھنے، سننے اور سنانے کے شوق نے مجھے جن راستوں اور پگڈنڈیوں تک پہنچایا، وہاں میری ملاقات جاوید دانش سے ہوئی۔''(۱۴)

اس جوڑی نے پھر تعاون جاری رکھا۔ عالمی لوک کہانیوں کا ترجمہ کیا اور ایک مجموعہ ''ورثہ'' مرتب ہو گیا۔ فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے مسائل کا تجزیہ، یہودی اور فلسطینی ادیبوں کی تخلیقات کا ترجمہ کر کے ''ایک باپ کی اولاد'' نامی کتاب مرتب کر دی۔

خالد سہیل تجربے کیوں کرتا ہے؟ اس کے تجربات کے محرکات کیا ہیں؟ ایسے سوالات کے حتمی جوابات تو شاید موجود نہیں ہیں لیکن اس کی تحریروں کی بنیاد پر اندازے لگائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل دو بیانات قابل غور ہیں:

شمالی امریکہ میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کا ادبی ورثہ قابل قدر ہے۔

مجھے امید ہے کہ ایک دن اردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس موضوع پر تحقیق کر کے، پی ایچ ڈی کا Thesis تیار کر لے گا۔(۱۵)

ہر فنکار کی طرح خالد سہیل کی نظر بھی مستقبل پر ہے۔ اسی سوچ کا نتیجہ انفرادی اور معاشرتی نفسیات اور ادبی مجادلے، (بزبان انگریزی) کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ پہلی کتاب میں وہ اپنی بکھری سوچوں اور روح کی جھلکیوں کو خطوط اور انٹرویوز کی شکل میں یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ

دوسری کتاب میں وہ مغرب میں آباد دوسرے اردو ادیبوں کے خیالات کو انٹرویز کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ دوسروں سے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ اپنے بارے میں بتاتا ہے۔

میں نے جب زندگی کی آغوش میں آنکھ کھولی تو اپنی چھوٹی سی دنیا کو روایات کی اونچی دیواروں میں محصور پایا۔

اس ماحول میں اندھا ایمان قابل قدر تھا۔ شک کرنا گناہ اور سوال پوچھنا جرم۔

میں نے اپنے قلم کو کدال بنایا تو میرے لئے دیواروں میں کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

میں پرامید ہوں کہ روایات کے حصار سے نکلنے کی جدوجہد اور کھڑکیاں ''تراشنے'' کی کوشش میں ہمیں کسی موڑ پر نئے دروازے بھی خیر مقدم کرتے ملیں گے۔ (۱۶)

''ادبی مجادلے'' کو تھامتے ہی ایک سوال ہمیں گرفت میں لے لیتا ہے: اردو ادیبوں کے انٹرویوز پر مشتمل یہ کتاب انگریزی میں کیوں ہے؟

کتاب کے تعارف کے مطابق اس کا ایک محرک خالد سہیل کی یہ خواہش تھی کہ تارک وطن ادیبوں کے تجربات اور نظریات کی مدد سے یہ معلوم کیا جائے کہ ہجرت کے عمل نے ان کی تخلیقی زندگی پر کیسے اثرات مرتب کئے ہیں۔ جو تجربات خود خالد سہیل کو کنیڈا میں ہوئے، ان کا ذکر اردو زبان میں کرنا اسے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ (۱۷)۔ اکثر انٹرویوز کو انگریزی میں کرنے کا مقصد دوسروں کو اس مشکل سے بچانا بھی ہو سکتا ہے۔

مختلف لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے، خالد سہیل کو ادب تخلیق کرنا، زندگی کیلئے پانی مہیا کرنے کے مترادف معلوم ہوا۔ اس کے خیال میں شاعر لوگ ایسے فن کار ہوتے ہیں جو بارش کا انتظار کرتے ہیں۔ جب بادل آتے ہیں، تب ہی رم جھم ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کو اپنی سیرابی کیلئے دریا سے پانی بھر کر لانا ہوتا

ہے اور ناول نگار وہ محنتی لوگ ہوتے ہیں جو گھر کے پچھلے صحن میں کنواں کھودتے رہتے ہیں۔ اسی مشقت سے انہیں پانی دستیاب ہوتا ہے اور وہی انہیں سرشار کرتا ہے۔ (۱۸)

بارہ ادیبوں سے گفتگو کے بعد جو خصوصیات فن کاروں میں مشترک تھیں، ان کی تعداد خالد سہیل نے دس بتائی ہے۔ شرمیلاپن، انکساری، خوداعتمادی، ذہنی کشادگی، غیر رسمی انداز فکر، غیر روایتی طرز زندگی، تحریک کا ہوتے رہنا، ذہانت، دانش اور انسانی اقدار کے فلسفہ پر اعتماد۔ (۱۹)

تعارف میں تارک وطن ادیبوں کے مستقبل پر بات کرتے ہوئے خالد سہیل نے لکھا ہے کہ نئے ملک میں بعض لوگ خود کو مرکزی دھارے کا حصہ محسوس نہیں کرتے چونکہ وہ میزبان ملک کی زبان میں ادب تخلیق نہیں کرتے جبکہ بعض دوسرے ادیبوں کیلئے ایک کلچر میں پرورش پانا اور دوسرے کلچر میں زندگی بسر کرنا دو دنیاؤں کے بہترین حصوں سے مستفید ہونے کے مترادف ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی امریکہ کے اردو ادیبوں سے متعلق ممکنہ تحقیق کیلئے خالد سہیل نے ابتدائی کام کر دیا ہے۔

ہمارے اعمال ہماری شخصیت کا نقش بناتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ ہمارا میل ملاپ، لین دین اور کام کاج کا سلسلہ چلتا رہتا ہے ان سب کی رائیں جمع کرنے سے وہ ہیولا دستیاب ہو جاتا ہے جو اصل شخصیت کے اچھا خاصا قریب ہوتا ہے۔

فنکاروں کی تخلیقات انکے اعمال ہی ہوتے ہیں۔ مصور کا برش، مصنف کا قلم اور موسیقار کا ساز، وہ اوزار ہوتے ہیں جن کی کارکردگی سے فنکار اپنی تخلیقات تراشتے ہیں۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ ان کا مواد ہوتا ہے اور جس ترتیب سے ان کی تخلیق وجود پاتی ہے وہ ہیئت کی صورت میں ناظر کے سامنے آجاتی ہے۔ ان سب اشیاء، اعمال اور افکار میں جتنی زیادہ وحدت ہوگی، تخلیق

کا نقش اسی قدر واضح ہو گا۔

بعض اوقات فنکار کے پیچیدہ تجربات کے باعث خام مواد کے ساتھ اوزاروں کی چھیڑ چھاڑ سے جو ہیولا ابھرتا ہے وہ غیر واضح نظر آتا ہے۔ تاثر میں وحدت کی بجائے انتشار نمایاں ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اساتذہ ریاض کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ریاضت سُر اور ساز میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ برش، رنگ اور کاغذ کے ملاپ سے مطلوبہ ارتعاش کو گرفت میں لینے کا گر سکھاتی ہے اور لفظ کو باعتبار ہیئت میں ڈھلنے کا سلیقہ مہیا کرتی ہے۔

خالد سہیل کی کتابیں اس کے فکری ریاض کا ثبوت ہیں۔ ان کا مواد خالد سہیل کے ذہنی ارتقاء کی خبر دیتا ہے۔ باقی رہ گئی فنی نشو و نما، تو اس کی چھان پھٹک کر لیتے ہیں۔

اپنے تخلیقی سفر میں خالد سہیل نے حکایت کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔ ''آزاد فضائیں'' اگرچہ ان کی شاعری کا مجموعہ تھا لیکن پیش لفظ میں، شاعر ہمیں تمثیلی انداز میں ایک پرندے کی کہانی سناتا ہے۔ ''امن کی دیوی'' میں شامل اسرائیل کے سفرنامے میں مصنف اس فرنچ پروفیسر سے متاثر ہوتا ہے جو اپنا مافی الضمیر کہانیوں کی مدد سے بیان کرتا ہے۔ منتخب عالمی کہانیوں کا ترجمہ ''سوغات'' اور عالمی لوک کہانیوں کا مجموعہ ''ورثہ'' بھی خالد سہیل کی اس محبت کا اظہار ہیں جو انہیں کہانی سے ہے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی حکایت کا دامن پکڑ لے اور کہانی سے اسے محبت ہو وہ فنی اعتبار سے ایک اچھا افسانہ نگار ہے؟

اگر ایسی بات ہوتی تو ترقی پسندی کے نام پر لکھے گئے ناکام افسانوں کے جھول کوئی بیان نہ کرتا۔ مثالی معاشرے کیلئے ان افسانوں کے کردار بہت واضح خواب دیکھتے تھے۔ خامی ان کی یہ تھی کہ وہ کردار افسانے کی صورت حال کے مطابق سوچنے اور متحرک ہونے کی بجائے افسانہ نگار کے ہاتھ کی پتلی کی طرح ناچتے تھے۔

فکشن کا خالق زندگی کے کینوس پر جزئیات کی مدد سے صورت حال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے جہاں اس کے کردار اپنی سطح کے مطابق جذباتی عمل اور ردعمل کا پیانہ ہوتے ہیں۔ اس پورے منظر میں کوئی نشوونما بغیر وجہ کے نہیں ہوتی وہ صورت حال نتیجہ ہوتی ہے اور صورت حال پر اثر انداز ہوتی ہے۔

خالد سہیل نے اپنی نشوونما کی داستان ''بھگوان، ایمان، انسان'' کے دیباچے میں ایک خط کی صورت میں سنائی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اسلامی اقدار سے پہلے تو وہ روحانی اقدار تک پہنچا اور پھر انسانی اقدار تک۔ آخری حصہ میں مصنف نے لکھا ہے۔ ''میرا یہ ایمان ہے کہ کائنات چند اصولوں اور قوانین کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ ہم جس قدر ان قوانین اور اصولوں سے واقف ہوں گے اسی قدر ہم زندگی کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوں''۔

خالد سہیل کے مثالی معاشرے کی بنیاد نئی صورت حال کو ویسے ہی قبول کرنا ہے جیسی کہ وہ نظر آرہی ہے۔ اپنے اسی رویے سے اس کے کردار اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ''کچے دھاگے'' کا شعیب اپنی بیوی شمسہ کو اپنے ایک دوست جورج کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ Gay ہے:

''کیا وہ اکیلا رہتا ہے؟'' شمسہ پوچھتی ہے

''نہیں۔ وہ اپنے Lover بل کے ساتھ رہتا ہے۔''

''تو جورج کو اکیلے کیوں بلاتے ہو؟ بل کو بھی بلالو۔'' شمسہ کہتی ہے (۲۰)

اس افسانے میں شمسہ کے ہاں معصومیت اور وسعت نظر ایک ہی وقت میں ملتی ہے۔ یہ کہاں سے آئی اور کیسے آئی؟ اس بات کا سراغ ہمیں افسانے میں نہیں ملتا۔

خالد سہیل کی تحریروں میں جن حقیقتوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے وہ

مغرب کی زندگی کا روزمرہ ہیں۔ مثلاً جنسی تعلق، افزائش نسل سے مشروط نہیں رہا۔ شادی کے ادارے پر سوالیہ نشان کا موجود رہنا۔ باکرہ دلہن کے تقاضے کو زمانۂ جہالت کا نشان سمجھنا۔ ماں کے روایتی رول کا خاتمہ۔ جنسی اقلیتوں کیلئے مساوی حقوق کی تحریک۔ مذہبی رویے پر نظر ثانی کی ضرورت، اور نسلی تعصب سے چھٹکارا ایسی سب خالد سہیل کے موضوعات ہیں۔ ان کو بیان کرنے کیلئے وہ خط، ڈائری اور کہانی وغیرہ کا سہارا لیتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ راوی کی زبان سے ایک کیس ہسٹری سنا دیتا ہے۔ مثلاً ''دو خبریں'' نامی افسانے میں سلمان کی کہانی۔ شروع ہی میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ سلمان نے ایک وقت، ایک عورت سے تعلقات کو قبول نہیں کیا تھا چنانچہ وہ ڈیبی کی خواہش کے مطابق اس سے شادی نہیں کرتا۔ ہاں پارٹ ٹائم محبوبہ کی جگہ اسے ضرور مل جاتی ہے۔ سلمان جب ڈیبی سے شادی کرنے پر تیار ہوتا ہے تو ڈیبی اسے چھوڑ جاتی ہے۔ مجبوراً سلمان اپنی ماں کے کہنے پر ایک پاکستانی دوشیزہ ساحرہ سے شادی کر لیتا ہے۔ افسانے کے آخر میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے ساحرہ کا ایک عاشق پاکستان میں موجود تھا۔ کینڈین ویزا حاصل ہو جانے کے بعد ساحرہ سلمان سے الگ ہو جاتی ہے اور اپنے محبوب کے لئے امیگریشن اپلائی کرتی ہے۔ اس خبر کے بعد سلمان راوی کو دوسری خبر سناتا ہے: ڈیبی اس سے ملنا چاہتی ہے۔

''دو کشتیوں میں سوار'' نامی افسانے کے بارے میں خالد سہیل کا دعویٰ ہے۔ ''میں نے عورت کو توانا، آزاد اور خود مختار پیش کیا ہے۔ اس لئے اس افسانے کا مقصد قارئین کے جنسی جذبات کو بھڑکانا ہرگز نہیں بلکہ عورتوں کی Li-bration کے پروسیس کو ہائی لائٹ کرنا ہے۔'' (۲۱)

مذکورہ کہانی کینیڈا میں رہنے والی ایک پاکستانی عورت کے بارے میں ہے جو اپنے خاوند سے الگ ہو کر اپنی بچی کے ساتھ رہتی ہے۔ کہانی اس شام شروع ہوتی ہے جب ماں کو اپنے نئے محبوب رابرٹ کے ساتھ باہر جانا ہے۔ بیٹی شبانہ کو یہ پسند نہیں۔ بے بی سٹر باربرا کا مشورہ ہے کہ ڈیٹ کینسل نہ کی جائے

ورنہ باقی زندگی پھر بچی ہی فیصلے کیا کرے گی۔ رابرٹ کی یاد آنے والی سرگوشیوں کی مدد سے شبانہ کی ماں باربرا کا کہنا مان لیتی ہے۔

کبھی کبھار خالد سہیل ..... جنگل کا بوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے زمین سے سر باہر نکالنے کے بعد مناسب دیکھ بھال نہیں ہوئی۔ باقاعدگی سے پانی نہیں ملا۔ شاخوں کی کانٹ چھانٹ بھی نہیں ہوئی۔ زمین کی گود میں فطرت کے رحم و کرم پر پلنے والا یہ پودا باغ کا بوٹا نہیں لگتا جہاں مالی ہوتا ہے۔ جو پانی سینچتا ہے۔ وہاں پر درختوں کو سائے اور پھل کیلئے پالا پوسا جاتا ہے لیکن جنگل کے بوٹے کا اکھوا خود ہی پھوٹتا ہے۔ اس کا حسن بے ترتیبی میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس کا پھل کسی منصوبے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

جس زمانہ میں خالد سہیل پاکستان میں تھا وہاں پر ان دنوں بہتر زندگی کے حصول کیلئے کئی تحریکیں موجود تھیں اور طلباء ان کے لئے متحرک بھی تھے۔ انکے اثرات خالد سہیل پر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی دانش سے سیلف میڈ لہروں کا تاثر ملتا ہے۔

خالد سہیل کے تازہ ترین افسانوی مجموعہ میں شامل افسانوں کے عنوان چونکاتے بہت ہیں۔ مثلاً چنگاریاں، تسبیح کے دانے، کٹی ہوئی پتنگیں، شہوت بھری آنکھیں، شانتی ایک فاحشہ وغیرہ۔ مصنف نے ''خوش قسمت اور پر امید'' کے عنوان سے تعارف میں لکھا ہے: ''میں اپنی ذات کو اس درخت کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی جڑیں مشرق کی مٹی میں پیوست توانائی حاصل کر رہی ہوں اور جس کی شاخیں مغرب کی فضا میں جھولتی ہوئی تازہ ہوا میں سرشار ہوں۔'' (سال اشاعت 1994)

خالد سہیل نے اپنی پہلی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا: ''جب اپنے ماحول کو اپنی ذات پر تنگ ہوتے ہوئے پایا، گھٹن اور حبس کا احساس بڑھنے لگا۔ اپنے گھر سے اجنبیت ہونے لگی تو میں ہجرت کی وادیوں سے گزرتا ہوا اپنی کائنات سے ایک نیا رشتہ دریافت کرتے نکل کھڑا ہوا۔'' (سال اشاعت ۱۹۸۶ء)۔

جس پڑھنے والے نے خالد سہیل کی تحریروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے، وہ سوچتا ہے۔ کیا آٹھ سالہ مسافت نے اسے منزل تک پہنچادیا؟ درخت کی شکل کس نے اختیار کرلی؟ سولہ کتابیں پہلے، جس پرندے نے اڑان بھری تھی، اس کے گھونسلے کا کیا ہوا؟ جس درخت کی شاخیں تازہ ہوا میں جھولتی ہیں۔ اس کا پھل کہاں ہے؟

سارتر نے لکھا تھا: ''وہ کالا جو دوسروں کو اپنی ذات سے آشنائی کی دعوت دیتا ہے وہ انہیں اپنی روح کا آئینہ دکھاتا ہے۔ وہ آدھا پیغمبر ہے اور آدھا پیروکار'' (کالے جسموں کی ریاضت)۔

لمبی اڑان کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ قیام کا وقفہ خالد سہیل کا نیا تجربہ ہے۔ جونہی شمالی دنیا کے جنوب دشمن عقیدوں کا باطن اس پر منکشف ہوگا یہ نئی اڑان بھرے گا جو اسے اکسائے گی کہ ''امن کی دیوی'' کے ترجموں کی بجائے یہ طبعزاد افسانے لکھے۔ اب فکری ریاض کی بجائے اسے تخلیقی مشقت کرنا ہے۔ عقیدوں کے شہر میں تجربوں کے اس آدمی کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ فکشن میں اسے اپنی فکری تصویروں کیلئے تخلیقی فوکس کی صورت ہے۔

اشاریہ :

۱۔ شاعری کا مجموعہ۔ سال اشاعت ۱۹۸۶ء

۲۔ ''جرأت پرواز'' دیباچہ ''آزاد فضائیں'' (مجموعۂ کلام)

۳۔ مطبوعہ ''افکار'' کراچی شمارہ ۶/۹۳

۴۔ سال اشاعت ۱۹۸۷ء

۵۔ ''تھکی ہوئی زندگی'' از زندگی میں خلاء

۶۔ زندگی میں خلاء

۷۔ جڑیں، شاخیں، پھل

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ خاندان کی بنتی بگڑی تصویریں : از انفرادی اور معاشرتی نفسیات

۱۲۔ تلاش (مجموعۂ کلام)

۱۳۔ عورتوں سے رشتے : از انفرادی اور معاشرتی نفسیات

۱۴۔ کچھ ورثہ کے بارے میں از ''ورثہ''

۱۵۔ شمالی امریکہ میں اردو ادب : از ''شناخت کی تلاش'' مرتب سائیں سچا

۱۶۔ اپنی ذات کے حوالے سے : از انفرادی اور معاشرتی نفسیات

۱۷۔ ادبی مجادلے (بیدار بخت سے انٹرویو)

۱۸۔ ادبی مجادلے تعارف

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ''شاعر'' بمبئی شمارہ برائے اکتوبر 1993ء

۲۱۔ ایک خط کے جواب میں از ''دو کشتیوں میں سوار''

"ماڈرن درویش یا معمہ؟"

(خالص ذاتی تاثر)

☆☆

جاوید دانش (کینڈا)

کردار نگاری میرا محبوب مشغلہ ہے، مگر یہ کردار میرے ڈراموں کے مردوزن ہوتے ہیں، جنکی حرکات و سکنات کی ڈور میرے ہاتھ میں ہوتی ہے! کبھی مجھے ان معصوم یا مظلوم کرداروں پر پیار آتا ہے، کبھی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے اور کبھی کبھی غصہ بھی آجاتا ہے...... جس کا ردعمل ان کے مکالمات میں جھلکتا ہے! مگر بنیادی طور پر اپنی تمام تر خود مختاری کے باوجود میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کرداروں کو زیادہ سے زیادہ حقیقی تخلیق کیا جائے۔

اس کے برعکس خاکہ نگاری سے میں گریز کرتا ہوں، کیونکہ نہ کسی کا کردار میرے بس میں، ہے نہ ہی کسی کی من وعن شبیہ کاغذ پر پوری ایمانداری سے اتاری جاسکتی ہے۔ اول تو لوگ سو فیصد سچائی سے خوش نہیں ہوتے، دوم لوگ اگر خوش ہو بھی جائیں تو جس کا خاکہ لکھا گیا ہے وہ خاکہ نگار سے برہم ہو جاتا ہے یعنی خاکم بدہن۔ خصوصاً کسی دوست کا خاکہ یا کسی ہم عصر ادیب کا خاکہ لکھنا۔ ''آ بیل مجھے مار'' کے مترادف ہے!

پھر بھی آج میں ایک دوست کا خاکہ رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں

جو نہ صرف مجھے عزیز ہے بلکہ ہر دل عزیز تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے پیشے میں کامیاب اور زندگی سے مطمئن بھی ہے۔ آپ ایسے کتنے لوگوں کو جانتے ہیں جو اس دور میں اپنے ''پیشے اور زندگی'' دونوں سے مطمئن ہوں ؟

ہم لوگوں کے اشتراکی دوست اشفاق حسین نے ۸۴ء نیویارک کے ایک مشاعرے میں، مجھ سے تعارف کراتے ہوئے کہا، دانش! آپ ہیں خالد سہیل، جنہیں تم تلاش کر رہے تھے...... اور سہیل! بھئی یہ ہیں دانش، جنہیں تم پوچھ رہے تھے''۔ ہم لوگ بڑی گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے۔ سہیل مجھے پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں ہی بہت اچھا لگا!

چہرے پر والہانہ طور پر بے ترتیب داڑھی، بڑے بڑے گھنگھریالے بال، جنہیں کاکل کہنے کو جی چاہے، روشن گہری آنکھیں، ساتھ ہی مقناطیسی حد تک پرکشش مسکراہٹ، مستانہ انداز مگر ڈھیلی ڈھالی چال (جس سے موصوف کی کج روی کا اندازہ ہو رہا تھا) چہرے اور داڑھی سے نظریں ہٹیں تو نگاہ قیمتی سوٹ اور اطالوی ریشمی ٹائی کی چست گرہ میں اٹک گئی۔ ایسا لگا میں دو مختلف تصویروں کو ساتھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں Intellectual سہیل پر پتہ نہیں کیوں، اس وقت یا اس مشاعرے میں سوٹ کچھ جچ نہیں رہا تھا۔ حالانکہ اردو والوں نے ادیب اور افلاس کو لازم وملزوم قرار دے رکھا تھا، مگر میں نے اپنے لاشعور سے اس کج کو نکال پھینکا ہے۔ میں تو بس سوٹ کی جگہ قیمتی Raw Silk یا کھدر کے کرتا پاجامے میں ادیب یا فنکار کو زیادہ Romantic تصور کرتا ہوں۔ پھر وہ ادیب ہو، داڑھی بردار بھی ہو اور درویش نما بھی ؛ دھیمے لہجے میں ناپ تول کر بات کرنے کے انداز نے دوبارہ مجھے اپنے دام میں گھیر لیا تھا۔ گفتگو کے دوران مجھے لگ رہا تھا کہ اس شبیہ کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ پھر میں خود بخود مسکرا دیا، سہیل کے چہرے پر مجھے اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ اس پر آشوب دور میں خاکسار نے بھی والہانی طور پر داڑھی اور حسنِ اتفاق سے اپنے گھنگریالے بالوں کی خوب خوب پرورش کر رکھی تھی۔ ہائے کیا دن تھے! سہیل سے نہ صرف دوستی مضبوط ہوئی

بلکہ میں نیویارک چھوڑ، ٹورانٹو آن بسا! ایک دوسرے کے قریب آنے سے طرفین کو سمجھنے کا موقع ملا، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج تک سہیل کو لوگ میرا بھائی تصور کرتے ہیں، حالانکہ ہم دونوں کے مزاج اور نقطۂ نظر میں زیر زبر کا فرق ضرور ہے مگر ہماری دوستی اور ادبی ''Commitment'' اپنی جگہ مسلم ہے۔

خالد سہیل کے چاہنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے (جس میں عورتوں کے ووٹ زیادہ ہوں گے) اتنی ہی طویل فہرست ان لوگوں کی ہے جو موصوف کو، ایک معمہ، سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی بہت ہیں جو کسی مصلحت کے بنا سامنے جی حضوری کرتے ہیں اور پیچھے اس کی خوب ہنسی اڑاتے ہیں۔ ایسے دوست بھی ہیں جو (مذاقاً سہی) مگر ادب کے ساتھ حضور کو ''پیر یا گرو'' کہتے ہیں، اور ایسا گروہ بھی موجود ہے جو سہیل کے بے باک قلم کو ''فحش نگار'' اور اسے ''پلے بوائے'' کہہ کر اپنے پروگراموں میں بلانے سے گریز کرتا ہے۔ نیم ملاؤں یا نیم ادیب حضرات (پورا ادیب اس شہر بے مثال میں عنقا ہے) کی بے اعتنائی سے مکمل اور صحتمند اور ادیب و شاعر خالد سہیل کی شخصیت اور صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کامیاب ماہر نفسیات اور بے باک قلمکار سہیل ہر ایک سے مسکرا کر پیش آتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ہنر اس نے نفسیات کی بھاری بھر کم کتابوں سے سیکھا ہو۔ یہاں میں اس کے ادبی قد کا تجزیہ نہیں کر رہا (اب ہمارے اساتذہ اور نقاد حضرات کو بھی تو کچھ کرنا ہے) نہ ہی سہیل کی شخصیت کی دبیز پرتوں سے پردہ اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں (یہ ہنر تو کسی "Analyst" کا پراجیکٹ ہے)

میں صرف سہیل کی "Multi Dimensional" شخصیت کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں:

1991ء فروری میں، جاپان کا سفر کرتے ہوئے اور ''مزید آوارگی''، رقم کرتے ہوئے، پھر جاپانی مسکراہٹ، حلیمی اور انکار نہ کر سکنے کی ادا وغیرہ کے مطالعہ کے دوران مجھے سہیل کی یاد بے اختیار آئی۔ جاپانی مسکراہٹ اور حلیمی سارے عالم میں مشہور ہے۔ ساتھ ہی جاپانیوں کی وضع داری میں کسی کو

''نہیں'' یا انکار نہ کر سکنے کی ادا بھی عجیب و غریب ہے...... سہیل کے بزرگ گو کشمیر جنت نظیر سے اٹھ کر زندہ دلان لاہور میں شامل ہوئے تھے مگر خالد سہیل روحانی طور پر لگتا ہے جاپانی ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ میں حلیمی بھی ہے اور شاذ و نادر ہی کسی کو ''نہیں'' کہتا ہے۔ جاپانیوں کی طرح وہ ''انکار'' کو ہاں اور نہیں کے درمیان رکھتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سہیل کسی طور لکھنوی طرز کا وضع دار نہیں ہے۔ نہ ہی اپنے اصولوں اور نقطۂ نظر کے معاملے میں سمجھوتہ کرتا ہے، مگر مسکراہٹ اور متانت کے طفیل اکثر اس کے خیالات سے اتفاق نہ کرنے والے بھی کم از کم اس کے سامنے متفق نظر آتے ہیں۔

خالد سہیل خود ساختہ انسان ہے۔ والدین نے اسے (ہر دیسی پیرنٹ کی طرح) بڑے چاؤ سے ڈاکٹر بنایا تھا کہ سماجی "Status" کے ساتھ خدمت خلق کرتا رہے، مگر سہیل ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ بن گئے ادیب و شاعر (جس پر ہمارے والدین آج بھی بہت فخر محسوس نہیں کرتے) یہ اور بات ہے کہ خدمت خلق وہ نفسیات کے میدان میں کر رہا ہے۔ طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے اور فطرت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر وقت کچھ نیا کرنے اور سیکھنے پر آمادہ رہتا ہے۔ نفسیات گو اس کا پیشہ ہے مگر فلسفے سے اس کا لگاؤ گہرا ہے۔ وہ کسی بھی مذہبی عقیدے کو نہیں مانتا ہے اور اپنی طرز کا "Atheist" ہے مگر کھلے طور پر کسی مذہب کی مذمت بھی نہیں کرتا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ حالانکہ اس کی کچھ تحریریں کچھ لوگوں کو گراں گذرتی ہیں۔ وہ کسی محدود کلیئے یا کسی ازم یا مکتب فکر سے بے نیاز اور لاپرواہ، خود میں مگن ہے، خود ہی سے سرشار بھی رہتا ہے، سہیل ان مسافروں میں سے ہے جو آزمودہ شاہراہوں کو چھوڑ کر ٹوٹی پھوٹی مگر نئی پگڈنڈیوں سے ہوتا اپنی منزل خود متعین کرتا ہے۔ وہ انسان اور کائنات کے درمیان ایک نئے تخلیقی رشتے کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ وہ خود کو Mystical کہلانا پسند کرتا ہے۔ اور روحانیت پر یقین رکھتا ہے مگر جسم (صنف مخالف کا) بھی عزیز رکھتا ہے۔ اس کی منظوم تحریریں اور افسانے

اس کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کی سہیلیوں (Girl Friends) کی فہرست طویل ہوا کرتی تھی، مگر ہمارا ''کنہیا'' اب ''گوری گوپیوں'' میں وہ دلچسپی نہیں لیتا جو آج سے چند برس پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کی طبیعت میں قناعت آچکی ہے۔ بقول شخصے ''مل گیا تو شکر نہ ملا تو صبر''!

اس ماڈرن درویش کو اپنے جذبات پر بے پناہ قابو ہے، کچھ دوست اس بات پر بہت الجھتے ہیں کہ بندہ نہ اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے، نہ پسندیدگی کا، نہ ہی خوشی اور وارفتگی کا۔ معاملہ جو بھی وہ بڑی خندہ پیشانی سے اپنی مسکراہٹ کی سحر سے بات نظر انداز کر دیتا ہے۔ بہت کم لوگوں نے اسے دل گرفتہ یا رنجیدہ اور اداس دیکھا ہوگا۔ نہ ہی محفلوں میں بے اختیار قہقہہ لگاتے دیکھا ہوگا۔ یوں تو اس کی شخصیت میں بہت توازن ہے، مگر شاذ و نادر ہی میں نے اس کی پیشانی پر شکنیں دیکھی ہیں۔ کبھی کوئی بات ناگوار خاطر گذری تو ایک لمحے کیلئے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، پھر خاموشی ہوتی ہے۔ مگر دوسرے لمحے وہ پھر نارمل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ نفسیات کی طبع آزمائی وہ جتنی اپنی ذات پر خود پر کرتا ہے دوسروں پر کم کرتا ہوگا۔ میرے نزدیک اپنا تجزیہ آسان نہیں، یہ اس کا بڑا پن ہے۔ بنیادی طور پر سہیل سادہ لوح اور آزاد منش ہے۔ اس کی رنگین مزاجی اپنی جگہ۔ گھر کی صفائی اور خود کی دیکھ بھال کے علاوہ زندگی کے ہر معاملے میں خود کفیل ہے۔ وہ گرہستی کی ضرورتوں اور خواہشوں سے ماورا ہے۔ اس میں کاہلی کا عنصر اور طبیعت کا رجحان بھی شامل ہے۔ راسپوتین اور ''میراجی (یہاں اشارہ میراجی کی طرز تحریر نہیں، ان کی بود و باش اور طرز زندگی کی طرف ہے) اس کے محبوب فنکار ایسے ہی تھوڑی ہیں؟

سہیل ایک "Non Conformist" ہے ''روایت شکنی اس کا شیوہ ہے۔ ... مگر کبھی کبھی روایت شکنی اس کی تحریر کو کھردرا بھی بنا دیتی ہے' اور زبان کی چاشنی کی کمی کھٹکتی ہے ..... یا منظومات میں شعریت کی جگہ "Statement" کا احساس ہوتا ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سہیل کے یہاں تازہ دم

خیالات اور موضوعات کی پرزور لہریں بند توڑ کر گذرتی محسوس ہوتی ہیں، جو اس کا اپنا اسلوب بیان ہے۔ یہ ساری کج کلاہی اس کی تحریر کا حصہ ہیں۔ ذاتی زندگی اور روزانہ کے معمول میں اس نے سادگی برقرار رکھی ہے، یعنی کوئی اس سے اتفاق نہ کرے تو وہ عموماً خاموش رہتا ہے۔ آج سے دس برس پہلے شاید وہ کسی کو نہ بخشتا ہو، کیونکہ اس کی پرانی تحریوں میں کاٹ نظر آتی ہے۔ اس کا ذہن صاف اور نقطۂ نظر اس کی تحریروں میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ وہ انسان دوست ہے اور خود کو "Humanist" کہلانا پسند کرتا ہے۔ وہ تنقید سے پرہیز کرتا ہے، کسی کو شاذ و نادر ہی اپنی رائے دیتا ہے، شاید یہ ایک ماہر نفسیات کی عملی صورت حال ہو۔ ہاں اسے سب سے زیادہ بوریت اس وقت ہوتی ہے۔ جب دوست یا رشتہ دار اس سے محفلوں یا اس کے دفتر کے باہر نفسیاتی مشورہ مانگتے ہیں۔ بہت قریبی دوستوں کو (جو انگلی پر گنے جا سکتے ہیں) کوئی رائے دینا ہو تو تقریر کرنے یا فتوی دینے کے بجائے بہت سمجھا کر اپنائیت سے خط لکھتا ہے اور قابل قدر مشوروں سے نوازتا ہے، وہ بہت کم کسی کو برائی کہتا ہے یا کسی کی برا کرتا ہے۔ ایک زمانے میں بحث و مباحثہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اب وہ کسی سے بحث کرنے میں کتراتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی تحریروں کا تجزیہ دو ایک قریبی دوستوں سے کرواتا ہے اور کبھی کبھی ان کے مشوروں کو مانتا بھی ہے مگر عموماً وہ تنقید پسند نہیں یا برداشت نہیں کر سکتا ہے مگر وہ نقاد کو کبھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ ان کی بات کو ناپسند کر رہا ہے۔

سہیل بدرجہ اتم Practical Man ہے۔ وہ خواب بھی حقیقی دیکھتا ہے۔ Fantasy پر یقین نہیں رکھتا۔ رشتوں کی روایتی زنجیر سے نہ صرف آزاد ہے، بلکہ رفاقت کو اس نے نیا انداز عطا کیا ہے، اپنی فیملی کی جگہ اس نے اپنے پسند کی extended family کا انتخاب کیا ہے۔ مخلص ہونے کے باوجود قربت کے طلسم سے بیگانہ ہے۔ اپنے جذبات، احساسات اور رفاقت کو وہ اپنے طور پر برتتا ہے۔ کچھ لوگ اس رویے کو سرد مہری کا نام دیں گے مگر سہیل کو ایسی سرد مہری اور اس

کے اظہار میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی سردمہری یا احساسات کو نقاب لگانے کے بجائے اپنی تمام تر Irony کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اس کے افسانوں زندگی اور معاشقے اور Commitment کو، ہمعصر رشک اور حسد کے ملے جلے جذبے سے دیکھتے ہیں۔

اس کی تمام تر بغاوت، کج روی اور روایت شکنی کو لوگ چاہے جو لیبل لگائیں، مگر عام جوان کیلئے ایسی طرزِ زندگی Fantasy کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر کتنے ہیں جو اس Fantasy کو حقیقت کا پیراہن پہنا سکتے ہیں۔ روایت شکنی نے ایک طرف سہیل کو منفرد لہجہ اور شناخت عطا کی ہے تو دوسری طرف تنہائی کا کرب بھی عطا کیا ہے، وہ محفل میں رہ کر بھی تنہا ہے!

وہ اپنی انتہا پسندی میں بھی ایک مومن کا سا خلوص رکھتا ہے۔ جس کام میں ہاتھ لگاتا ہے اسے عبادت کی سی عقیدت کے ساتھ پورا کرتا ہے۔

مجھے آج تک ایسا کوئی ادیب یا شاعر نہیں ملا جو لکھنے پڑھنے میں سہیل جیسا سلیقہ شعار اور Organise ہو ہر کسی کو یہ حیرت ہوتی ہے کہ اس میں اتنی En-ergy کیونکر ہے کہ وہ افسانہ نگاری، شاعری، سفر نامے، تراجم، ڈائری مضامین، ساتھ ہی نئی کتابوں کی خریداری اور مطالعہ، خطوط کے جواب۔ فوٹوگرافی اور تصویروں کو قاعدے سے البم میں سجانا (جن کی تعداد پچاس سے کم نہیں) دنیا بھر کی سیر و سیاحت، مختلف ممالک میں سیمیناروں میں حاضری، مشاعروں میں اور نثری محفلوں میں حصہ لینا۔ پرانے محبوبوں کی دلجوئی (اب یہ سلسلہ فون پر ہوتا ہے) نئے محبوب کو ساتھ لئے پھرنا، دوستوں سے ملنا، فلم دیکھنا اور انہیں لے کر نئے نئے ریستوران جانا (کھانا پکانا اور گھر میں کھانے میں یقین نہ رکھنا) دوستوں کو لکھنے اور مطالعہ پر اکسانا، بازار اور "Mall" میں خواہ سوٹ خریدنا ہو یا پنسل بڑے شوق سے آوارگی کرنا اور بڑے چاؤ سے آئس کریم کھانا۔ بڑی پھرتی اور مہارت سے ریکٹ بال کھیلنا اور ان تمام عوامل کے دوران، جب جہاں

موقع ملے چند منٹوں کے لئے سو جانا (رات کی نیند کے علاوہ) اور روزانہ علی الصبح (عبادت گزار کی طرح) اٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھنا اور بغیر ناشتہ کئے اسپتال (دفتر) ایسے للک کے ساتھ جانا، جیسے بچے خوشی خوشی پارک جاتے ہوں۔ ہر کوئی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس انسان نما معمے کے پاس اتنا کچھ کر لینے کا وقت کیسے ملتا ہے۔ اسکی زود گوئی Commitment اور Energy پر دوستوں کو حیرت اور رشک ہوتا ہے۔ بقول شخصے "جتنی کتابیں سہیل نے تخلیق کی ہیں، اتنے خطوط ہم نے نہیں لکھے.......!

یہی کتابیں جن کی تعداد درجن سے اوپر ہیں، کم نہیں، اس کی زندگی، اس کی (ابتک کی) اولادیں ہیں۔ خالد سہیل آج تک مجرد زندگی گزارنے میں یقین رکھتے ہیں۔ آگے کی کس کو خبر شادی کر بھی لے، تو شاید اولاد کی ذمہ داری قبول کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ چاہتا بھی نہیں۔ مگر بچے اسے دوسروں کے پسند ہیں۔ وہ دوستوں اور بہن کے بچوں پر جان دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں سہیل کے اندر ایک ہمکتا ہوا بچہ آج بھی موجود ہے۔ یہی اس کی مسکراہٹ اور اس کی طبیعت کی تجسس کا راز ہے۔ وہ مسلسل اپنی تلاش میں سرگرم عمل ہے!

خالد سہیل کے ادبی قد کا تعین وقت کرے گا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اس کا انسانی وجود معتبر ہے۔ دوستوں کے لئے اور اس کے مریضوں کے لئے بھی

میرا تجربہ ہے کہ۔

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا!

ڈاکٹر خالد سہیل

کی

تصانیف

- ☆ تلاش : (شاعری)
- ☆ زندگی میں خلا : (افسانے)
- ☆ بریکنگ دی چینز : (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)
- ☆ اک پیروچ زنجیر : (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)
- ☆ سوغات : (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ)
- ☆ بھگوان، ایمان، انسان : (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)
- ☆ مغربی عورت، ادب اور زندگی :
  (مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ
- ☆ چنگاریاں : (افسانوں کا کیسٹ)
- ☆ تازہ ہوا کا جھونکا : (شاعری کا کیسٹ)

- ☆ ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک : (مقالے کا کیسیٹ)
- ☆ ٹوٹا ہوا آدمی : (دوناولٹ)
- ☆ انفرادی اور معاشرتی نفسیات : (مضامین)
- ☆ ورثہ : (لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)
- ☆ امن کی دیوی : (مشرق وسطی ر خلیج ۹۰ ر ۹۱ کی جنگ)
- ☆ کالے جسموں کی ریاضت : (افریقی ادب)
- ☆ ایک باپ کی اولاد : (عرب ر یہودی مسائل)
- ☆ ہر دور میں مصلوب : (Lesbian اور گے ادب و زندگی)
- ☆ دو کشتیوں میں سوار (افسانے)
- ☆ پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر (ادبی مضامین تراجم، انٹرویوز وغیرہ)

CL

Creative Links

CANADA